خصوصی شمارہ

علمِ سیرت ایک تعارف

دینی — اصلاحی — فکری — علمی

ماہنامہ

شاہراہِ علم

جامعہ کا پیغام ملتِ اسلامیہ کے نام

جنوری ۲۰۱۴ء — صفر المظفر، ربیع الاوّل ۱۴۳۵ھ

زیرِ سرپرستی

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی مدظلہ العالی

مدیر

حذیفہ مولانا غلام محمد صاحب وستانوی

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، نندوربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵







وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ)

ماھنامہ

"شاہراہِ علم"

اکل کوا

(جامعہ کا پیغام ملتِ اسلامیہ کے نام)

زیرِ سرپرستی

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی مدظلہٗ العالی

مدیر: حذیفہ مولانا غلام محمد وستانوی

جلد : ۳

شمارہ نمبر : ۱

ماہ : صفر المظفر، ربیع الاول

۱۴۳۵ / جنوری ۲۰۱۴ء

ترسیلِ زر کا پتہ

"دفترِ شاہراہِ علم"

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر، ۴۲۵۴۱۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

نوٹ: ماہنامہ "شاہراہ علم" مدیر و ایڈیٹر مولانا محمد حذیفہ غلام محمد وستانوی صاحب رندیرا" جامعہ کوارٹر جامعہ نگر اکل کوا
"

(... کمپوزنگ وسیٹنگ: رفیق احمد اشاعتی کٹیہاری/محمد سبحان اررياوی اشاعتی ......)

ضروری ہدایت

ماہنامہ "**شاہراہِ علم**" مہینہ شروع ہونے سے پانچ روز قبل گزشتہ مہینہ کی ۲۵ ؍تاریخ کو ہی روانہ کر دیا جاتا ہے، تاکہ پہلے عشرے تک موصول ہو سکے۔ لہٰذا ۱۰ ؍تاریخ تک موصول نہ ہونے کی صورت میں اپنے مقامی ڈاک خانہ میں تحقیق و کارروائی کریں، اور دو تین روز مزید انتظار کے بعد بھی دستیاب نہ ہو، تو دفتر شاہراہ علم کے نمبر پر رابطہ کریں۔ انشاء اللہ آپ کی شکایت دور کی جائے گی اور دوبارہ رسالہ روانہ کیا جائیگا۔

نوٹ: جن خریدار کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے اور وہ رسالہ جاری رکھنے کے لیے منی آرڈر روانہ کرتے ہیں تو اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔ اور نئے ممبران مکمل پتہ اور جدید خریدار لکھنا نہ بھولیں۔

ترسیل زر کے لیے ذیل میں دئے گئے پتہ پر E.MO یا اس کی سہولت نہ ہونے کی صورت میں سادہ منی آرڈر کریں اور بذریعہ فون منی آرڈر کرتے ہی اطلاع کر دیں۔

رابطہ اور ترسیل زر کے لیے
Office: Shahrah-e-Ilm
Jamia Islamia Isha'atul Uloom Akkalkuwa Nandurbar (M.S.) Pin. 425415

Email: shahraheilmmagazine@gmail.com
PH: 02567-252256-252356 Mb. 9011958392

اداریہ:

زندگی کے ہر شعبہ میں اتباع حضور ﷺ

مولانا حذیفہ مولانا غلام محمد صاحب وستانوی

اللہ رب العزت نے انسان کو چند امتیازی صفات سے متصف کر کے پیدا کیا، جو انسان ہی کا خاصہ ہے ،ان میں سے ایک ''وسیع تفکر وتدبر اور قوت گویائی'' ہے، اس کی قوتِ عقلیہ دیگر حیوانات کے مقابلہ میں وسیع تو ہے، مگر کامل نہیں ، وہ محسوسات پر غور خوض کر کے کچھ ظنی نتائج تو نکال سکتا ہے، مگر غیبیات پر اپنی عقل سے قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا، اور انسان کا اصل امتحان غیبیات ہی میں ہوتا ہے، اور چونکہ غیبیات جیسے خالق کا ہونا، مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا، جزا وسزا اور دنیوی زندگی کے حساب کتاب کا ہونا وغیرہ کو بتلانے کا ذریعہ سوائے وحی الٰہی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اور وحی کا تحمل کرنا ہر کس وناکس کے بس میں نہیں تھا، لہٰذا اللہ نے انسانوں میں سے بعض بندوں کو اپنی وحی کے لیے منتخب کیا، جس کا سلسلہ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء والمرسلین، سید البشر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا، جو بھی نبی جب بھی مبعوث کیا گیا، اس نے وحی کی روشنی میں اپنی امت کی اس کے اپنے زمانے میں مکمل طور پر ہر اعتبار سے رہنمائی کی اور پیغام الٰہی کے ابلاغ کا فریضہ پوری امانت داری کے ساتھ ادا کیا، بلکہ اس پر عمل کر کے بھی بتلایا اسی رب ذوالجلال نے قرآن میں بعثت انبیاء کا مقصد بیان کیا اور تمام انبیاء کی ستائش کی، ارشاد خداوندی ہے: ''**کل من الصالحین**'' تقریباً دس سے زائد انبیا کے نام ذکر کرنے کے بعد قرآن نے یہ کہا اور مزید آگے ارشاد الٰہی ہے : ''**وکلاً فضلنا علی العالمین**'' ان میں سے ہر ایک کو ہم نے دونوں جہاں والوں پر فضیلت دی، ہر نبی اور رسول اپنے زمانہ میں انسانوں کے لیے آئیڈیل اور نمونہ ہوتا تھا، اس پر رہنمائی صرف عبادت اور اعتقادات میں محدود نہیں ہوتی تھی، جیسا کہ (آج کے مادّہ پرست اور جدت پسند روشن خیال اعتقاد رکھتے ہیں) بلکہ زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہوتی تھی۔ قبلِ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم جو نبوت ورسالت کے ادوار تھے وہ محدود تھے اور سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر یہ محدود ادوار ختم ہو گئے اور اب

ایک ایسے نبی اور رسول کی بعثت عمل میں لائی گئی، جس کی نبوت ورسالت دائمی اور قیامت تک چلنے والی ہے اور جن کو ایسی کتاب وشریعت دی گئی، جو محیر العقول علوم کا سرچشمہ اور قیامت تک انسانوں کے دینی و دنیوی، معاشی، سیاسی، علمی اور روحانی مسائل کو حل کرنے کی کامل صلاحیت کی حامل ہے، جس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود خالقِ کون ومکاں نے لے لی، جسے قرآن کہا جاتا ہے، جس کے الفاظ ومعانی خاتم الانبیاء والمرسلین، احمد مجتبیٰ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی صورت میں ۲۳/سال کے عرصہ میں نازل ہوئے اور اس کے ہر ہر حکم پر عمل کر کے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے پیارے اور جاں نثار صحابہ نے بھی عمل کر کے بتایا، صرف آپ کی حیاتِ طیبہ ہی میں صحابہ نے عمل کر کے نہیں دکھلایا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرتِ آیات کے بعد بھی، تاکہ کوئی یہ بہانہ نہ بنا سکے کہ، نبی اور رسول تھے تو انہوں نے عمل کیا وہ منجاب اللہ موفق تھا، ہم سے نہیں ہوسکتا، تو ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرامؓ نے عمل کر کے دکھلا دیا، تاکہ انسان بہانہ بازی نہ کر سکے کیوں کہ اللہ انسان کی فطرت سے واقف ہے اور آپ کے بتلائے ہوئے خطوط پر آپ کی وفات کے بعد بھی عمل کر کے بتلایا تاکہ کوئی یہ گمان نہ کر بیٹھے کہ عذاب کے ڈر سے ہوسکتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں عمل کر لیا ہو، بلکہ حضرت ابوبکرؓ نے تو صاف اعلان کر دیا "اینقص الدین و انا حی" میرے جیتے جی دین میں کمی بھی ہوسکتی ہے کیا؟ صحابہ میں بچے، بوڑھے، جوان، مرد عورت، تاجر، کاشتکار، مزدور، غریب، مالدار، خوبصورت، بدصورت، عربی، عجمی، فارسی، رومی، شاعر، ادیب، جاہل، فاضل، دہاتی اور شہری سب تھے اور سب نے جانثاری وفا شعاری، جواں مردی اور اپنی نفسانی خواہشات کی مخالفت کر کے بتلائی اور قیامت تک آنے والوں کے لیے انفاق، اعمال صالحہ، جانثاری، اتحاد واتفاق اختلاف کی صورت میں حدود وقیود۔۔۔ ہر حالت میں شریعت کو مقدم رکھنا جان، مال، عزت، وقت، خواہش کو دین کے خاطر جب ضرورت ہو بلا جھجھک قربان کرنے کی مثالیں قائم کر کے دکھلائی، لہٰذا شریعت محمدیہ پر عمل ناممکن اور شریعت زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتی، دین صرف عبادت میں محسور ہے سیاست اور معیشت میں دین کو دخل نہیں وغیرہ بہانہ بازی کی کوئی گنجائش ہمارے لیے باقی نہیں ہے۔

آپ کی ذات چلتا ہوا قرآن تھی اور صحابہ بھی اس میں کم نہ تھے، اسی لیے تو علما نے سیر صحابہ یعنی صحابہ کے احوال وآثار کو بھی سیرت نبوی کا حصہ قرار دیا ہے۔

روایت اور درایت، عقل ونقل دونوں کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان کی عقل چونکہ محدود، اس کا علم بھی محدود اور نتائج پر بھی اس کی مکمل نظر نہیں، لہٰذا اسے اپنے خالق ہی کا تابعدار ہونا چاہیے، ورنہ تو وہ نقصان اور گھاٹے میں ہی ہوگا، اس لیے تو قرآن نے بھی صاف کہا "ان الانسان لفی خسر "انّ پھر الف لام کے ساتھ "انسان" پھر "لفی الخسر" پر لام تاکید، یعنی قطعی طور پر وہ خسارے میں ہے، اور خسارے سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے، وحی الٰہی کی پیروی "الا الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحت" کہکر اسی کی طرف اشارہ ہے، اور وحی انبیاء پر اور انبیاء امین بھی اور سو فیصدی وحی پر عمل کر کے بتلانے والے بھی، لہٰذا جس طرح ہر زمانہ کے انسان کی کامیابی کی ضمانت ان کے اپنے انبیاء کی پیروی تھی، تو اب ہماری یعنی امت محمدیہؐ کی کامیابی کا مکمل دارومدار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل پیروی میں ہی ہوگی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے لیے آپ کے احوال وآثار یعنی سیرت نبویہ کو جاننا ضروری ہوگا، کیونکہ جب تک آپ کے حضر، سفر، خوشی غمی وغیرہ کے حالات کا علم نہیں ہوگا، وہاں تک اس پر عمل بھی نہیں ہوگا، ساتھ ہی قرآن کا بھی حکم ہے "لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مکمل نمونہ ہے:

اسوۃ بمعنی قدوہ یعنی وہ طریقہ جس کی اقتداء کی جائے، اس جگہ مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں تمہارے لیے خصائل حمیدہ موجود ہیں، جو تمہارے لیے واجب العمل ہیں مثلاً لڑائی میں ثابت قدم رہنا اور شدائد کو برداشت کرنا۔

یا یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مقتدا ہیں، تمہارے لیے ان کی اقتداء ہی مناسب ہے، بعض نے کہا اُسوَۃ بروزن فُعْلَۃٍ اِیتِسَاء (باب افتعال) سے مشتق ہے، جیسے قدوۃ اقتداء سے بنا ہے، یہ اسم ہے جو مصدر کا قائم مقام ہے، یعنی تم لوگوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اچھی ہمدردی (لازم) ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی مدد کی تم بھی ویسی ہی دین کی مدد کرتے رہو۔ ان کا دانت جنگ میں ٹوٹا چہرہ زخمی ہوا ان کے چچا شہید ہوئے ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئی مگر انہوں نے ہر دکھ پر صبر کیا اور تمہاری ہمدردی کی لہٰذا تم بھی ان کی طرح مصائب وشدائد پر صبر رکھو اور ان سے ہمدردی کرو اور ان کے طریقہ پر چلو۔

وذکر اللّٰہ کثیرا اور اللہ کی بہت یاد کرتا ہے۔

دکھ میں بھی اور سکھ میں بھی کثرتِ ذکر دوام اطاعت کا سبب ہے، اسی لیے رجاء کے ساتھ کثرتِ ذکر کا ذکر کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کرنے والا وہی ہوسکتا ہے، جو امید بھی رکھتا ہو اور اللہ کا ہمیشہ اطاعت گزار بھی ہو۔ حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ حضرت عمر نے حجر اسود پر سر جھکا کر فرمایا میں بلا شبہ جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے لیکن اگر میں نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے اور چومتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے نہ چومتا نہ بوسہ دیتا۔ {**لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ**}

حضرت عمرؓ کا اتباع سنت:

یعلی بن منیہ کا بیان ہے میں نے حضرت عمر کے ساتھ طواف کیا جب میں حجر کے متصل دروازہ کے پاس رکن کے قریب پہنچا تو میں نے حضرت عمر کا ہاتھ پکڑ لیا تاکہ آپ بھی چولیں۔ حضرت عمر نے فرمایا کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طواف نہیں کیا، میں جواب دیا کیوں نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، تو کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کو چومتے دیکھا ہے میں نے فرمایا نہیں۔ فرمایا تو پھر اپنے سے اس کو دور رکھو۔ {**لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ**} (تفسیر مظہری، بحوالہ گلدستۂ تفاسیر)

لہٰذا عقل وشرع ہر دو اعتبار سے ہر مسلمان پر سیرت سے واقفیت ضروری ہے۔

اللہ نے اسی امت کو جو علمی صلاحیت عطا فرمائی ہے، وہ محض اس کا فضل خصوصی ہے اسی لیے اس امت نے قرنِ اول سے، جو تصنیف وتالیف اور علوم اسلامیہ وعربیہ کی تدوین وتوسیع کا کام شروع کیا ہے، الحمدللہ وہ مسلسل جاری وساری ہے، کیوں کہ اسلامی اور عربی علوم کا سرچشمہ قرآن ہے، اور قرآن کلام اللہ ہے اور کلام اللہ اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی ذات لامحدود، تو اس کی صفت بھی لامحدود ہے اور اس سے پھوٹنے والے علم کے سوتے بھی لامحدود، لہٰذا تمام علوم اسلامیہ وعربیہ دن بہ دن پھیلتے ہی جارہے ہیں اور کیوں نہ ہو قرآن کا اعلان ہے، اگر زمین کے تمام درخت قلم اور تمام سمندروں کا پانی روشنائی بن جائے، پھر بھی اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے، آپ علوم اسلامیہ عربیہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں کہ ہر شرعی علم میں کیسے کیسے عظیم اور عمیق تصنیفی وتالیفی کارنامے اس امت نے انجام دیے ہیں اور اب بھی دیتی چلی جارہی ہے، اگرچہ سلف وخلف کے کاموں میں فرق ہے کہ سلفِ امت علم کے ساتھ عمل کا مکمل اہتمام کرنے والے تھے، اور خلف میں بھی کچھ تو ہیں جو عمل کررہے ہیں مگر اکثر عمل سے دور

ہیں، اللہ توفیقِ علم کے ساتھ ساتھ توفیق عمل سے ہم سب کو بھی نوازے۔ آمین

جس طرح اسلامی علوم مثلاً تفسیر وحدیث، فقہ، اصول وغیرہ پر بے شمار تفصیلی واجمالی تصنیفات وتالیفات وجود میں آتی جارہی ہیں، بلکہ اتنی وجود میں آئی اور آتی جارہی ہیں، اس توسع کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے محض علومِ اسلامیہ کی تصانیف کی فہرست بھی مستقل ایک علم کی حیثیت اختیار کرگیا ہے، پہلے اس پر مجموعی کام ہوئے جیسے **الفہرست** ابن ندیم **مفتاح السعادۃ** طاش کبری زادہ **کشف الظنون** حاجی خلیفہ **معجم المصنفین**، **معجم المؤلفین** وغیرہ اوراب تو ایک ایک علم کی تصنیفات پر انفرادی کام ہورہے ہیں، مثلاً "**معجم مصنفات القرآن الکریم**" کے نام سے الدکتور علی شواخ اسحق نے چار جلدوں میں کتاب تیار کی، جس میں صرف قرآنیات پر لکھی گئی عربی کتابوں کا تعارف ہے اور جس کے اخیر میں مصنف لکھتے ہیں کہ "یہ تو جو کچھ مجھ کو میسر آیا ورنہ کتاب کی تیاری کے بعد بھی بہت سی کتابیں معرض وجود میں آئی اور بہت سی میرے دسترس سے باہر رہی ہوگی لہٰذا استیعاب کا دعویٰ نہیں کرسکتا، اس طرح حدیث کی کتابوں کے بارے میں "**معجم ما طبع من کتب السنۃ**" مصطفی عمار ملا کی اور "**دلیل مؤلفات الحدیث الشریف المطبوعۃ القدیمۃ والحدیثۃ**" اور "**المعجم المصنف لمؤلفات الحدیث الشریف**" اور عقائد کی عربی کتابوں کے بارے میں "**دلیل المکتبۃ العقدیۃ**" محمد بن عبدالعزیز کی عربی متون کے شروحات کے بارے میں "**موسوعۃ الشروح والحواشی**" عبداللہ الحبشی کی، اسی طرح سیرت نبوی پر بڑا وسیع کام ہوا ہے، اور صلاح الدین المنجد نے "**ماألف عن رسولی صلی اللہ علیہ وسلم**" کے عنوان سے عربی سیرت کی کتابوں کی فہرست تیار کی ہے، جو تقریباً ۲۴۴؍صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ۱۲؍ابواب ہیں، اور تقریباً تین ہزار سے زائد کتابوں کا تعارف ہے، مصنف خود مقدمہ میں کہتے ہیں کہ "جب میں نے سیرت کی کتابوں کے تعارف پر لکھنے کا ارادہ کیا تو تین سال تک محنت کرتا رہا اور سیرت پر لکھی گئی تمام کتابوں نام جمع کرنے کوشش کی مگر میں ایسا نہ کرسکا، میں حیران ہوگیا کہ علماء نے سیرت پر کتنا لکھا ہے!! آخر کار میں مجبور ہوگیا کہ استیعاب میرے لیے ناممکن ہے، میں اگر پوری زندگی بھی اس پر کھپادوں تو یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا ہے کہ میں اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں، لہٰذا میں نے مجبوراً حتی المقدور پر اکتفا کیا ہے۔"

آپ اسی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سیرت طیبہ پر کتنا لکھا گیا ہے، یہ تو صرف عربی میں اردو میں ہزاروں

کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اور انگریزی، ہندی وغیرہ اس پر مستزاد اور بے شمار کئی جلدوں پر مشتمل مجلّات کے سیرت نمبر کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں، اور ہو رہے ہیں، زوار اکیڈمی "السیرۃ عالمی" کے عنوان سے ۱۹۹۹ سے ہر ۶/ ماہ پر تقریباً ۳۵۰/ صفحات پر مشتمل سیرت کے عنوان پر شائع کر رہی ہے، یعنی پندرہ سال ہو چکے تقریباً دس ہزار سے زائد صفحات صرف سیرت پر اس ایک مجلہ کے شائع ہو چکے ہیں، اسی طرح مجلہ نقوش کا سیرت نمبر تقریباً پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، ماہنامہ تعمیر افکار کے ضخیم ضخیم تین خصوصی شمارے گویا عربی کے بعد سب سے زیادہ علوم اسلامیہ پر اگر کسی زبان میں کام ہوا ہے تو اردو میں، یہ سب ہمارے مدارس اسلامیہ کی برکت ہے، جو برصغیر میں اسلامی علوم کی اشاعت کا بے مثال کام انجام دے رہے ہیں، اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ فقیہ النفس علامہ رشید احمد گنگوہیؒ قدوہ "الطائفۃ المنصورۃ" حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ حاجی عابد حسین وغیرہ اکابرین کی دور اندیشی اور سحر گاہی دعاء کا ثمرہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ سیرت نبویہ پر چونکہ کام ہر پہلو سے ہوا ہے، اور وہ بھی تفصیل اور ابھی بھی جاری ہے، لہٰذا اس کا احاطہ مشکل ہے، جیسا کہ مذکورہ پیراگراف سے واضح ہوتا ہے، اور اب تو طباعت کی سہولت ہے، لہٰذا قدیم کام بھی تحقیق کے ساتھ اور مزید اس پر نئے حالات کی روشنی میں کام ہو رہا ہے، مختلف جامعات میں اسکالرس ماجستر اور دکتورہ کے مقالات ایک ایک عنوان کو چھان پھٹک کر لکھ رہے ہیں، جس سے علم سیرت کے نئے گوشے بھی سامنے آرہے ہیں، اور اب تو انٹرنیٹ کی وجہ سے جمع وترتیب اور تالیف وتحقیق کا کام بھی آسانی اور تیزی سے انجام پا رہا ہے، لہٰذا باذوق لوگ اپنے اپنے ذوق کے مطابق لگے ہوئے ہیں، کہیں اکیڈمیاں کام کر رہی ہیں، تو کہیں انفرادی کام ہو رہا ہے، جیسے فقہ اسلامی پر عربی میں "الموسوعۃ الفقہیۃ" کے نام سے حکومت کویت کی جانب سے ۴۵/ جلدوں میں ضخیم انسائیکلو پیڈیا، اسی طرح دبئی اور سعودی حکومت کے تعاون سے "معلمۃ قواعد الفقہ" کے عنوان سے ۲۵/ جلدوں میں قواعد الفقہ کا انسائیکلو پیڈیا تیا کیا گیا ہے، اسی طرح انفرادی کوششوں میں "الحاوی فی التفسیر" ۸۴۰/ جلدوں میں تفسیر قرآن تیار ہو کر انٹرنیٹ پر موجود ہے، اسی طرح "موسوعۃ احکام الطہارۃ" ابو عمر ذبیان بن محمد الذبیان کی تقریباً ۱۳/ جلدوں میں "موسوعۃ العلوم العربیۃ" الدکتور بدیع یعقوب نے دس جلدوں میں تیار کیا،، النحو الوافی چار ضخیم جلدوں میں، تاریخ میں "مقدمات العلوم و

المناهج" الاستاذ انوالجندی کی اسی طرح سیرت نبویہ کے عنوان پر "سبیل الھدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد" تقریباً ۱۴/ جلدوں میں سب سے ضخیم عربی میں سیرت کی کتاب ہے۔

مرورِ ایام اور کام کے توسع کے ساتھ اس تصنیفی وتالیفی میدان میں جہاں توسع کا کام ہوتا رہا، وہیں قواعد اور اصول اور مواد کی ترتیب کا کام بھی ہوتا رہا، جس طرح دیگر علوم اسلامیہ کے ساتھ ایسا ہوا کہ پہلے جمع قرآن، پھر تدوین قرآن، پھر تفسیر قرآن، پھر اصول التفسیر، قواعد التفسیر، پھر علوم القرآن، اسی طرح حدیث میں پہلے متن حدیث، پھر سند حدیث، پھر فن اسماء الرجال، پھر فن جرح وتعدیل، پھر فن اصول حدیث، پھر علوم حدیث مدون اور مرتب ہوتے رہے، اسی طرح سیرت کا بھی حال ہوا کہ یہ پہلے صرف مغازی، پھر سیرت، پھر فقہ السیرۃ پھر اصول سیرت پر کام ہوا اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا کہ، احاطہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

علم سیرت کے مختلف گوشوں پر تفصیلی کام کافی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، جس کا اندازہ سیرت کے مختلف عنوان پر ہوئے، مندرجہ ذیل کام سے ہوسکتا ہے:

(۱)......السیرۃ النبویۃ اہمیتہا اقسامہا مقاصدودراستہا، محمد بن سالم السلمی

(۲)......مصادر السیرۃ النبویۃ وتقویمہا، فاروق احمد حمادۃ

(۳)...السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ اکرام ضیاء العمری

(۴)......مصادر السیرۃ النبویۃ، سیف اللہ بن یحی الزہرانی

(۵)......مصادر السیرۃ النبویۃ بین المحدثین والمورخین: دکتور عبدالرزاق ہرماس

(۶)......الاساس فی السنۃ وفقہا (السیرۃ النبویۃ) دکتور سعید الحوی

(۷)......الفصول فی سیرۃ الرسول

(۸)...السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الاصلیۃ: الدکتور مہدی رزق اللہ احمد کی تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

علوم اسلامیہ میں جہاں توسع اور تدوین وترتیب کا کام ہوتا رہا، وہیں نا اہل اور اصحاب زیغ وضلال لوگوں نے بھی اپنے طور پر دخل اندازی کی، خاص طور پر قرون اولی میں معتزلہ، خوارج، روافض وغیرہ، فرق باطلہ

کے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کہ انہوں نے تفسر، حدیث، سیرت، فقہ وغیرہ کو اپنے خیالات اور اعتقادات کے تابع کر نے کی کوشش کی اور قرون اخری میں مستشرقین اور جدت پسندوں نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا، بلکہ کچھ نے نادانی میں اور اکثر نے عمداً سلف صالحین میں سے جنہوں نے صحیح کام کیا تھا ان کو بھی مطعون کرنے کی ناکام کوشش کی، اس پر بس نہیں کیا بلکہ مزید آگے بڑھ کر یہ بھ جرأت کرڈالی کہ قرآن وحدیث، سیرت فقہ پر بے جا اعتراضات قائم کیے اور تمام علومِ اسلامیہ کو مشکوک کرنے کوشش کی، جس کے نتیجہ میں پچھلے تقریباً دوسوسال میں بکثرت جدید فرق باطلہ وجود میں آئے، مثلاً اہل قرآن کے نام پر منکرینِ حدیث، اہل فطرت اور نیچری کے نام پر جدید عقلیت پسند طبقہ، جو اعتزال جدید کے مصداق ہیں، قادیانیت کے نام پر منکرین ختم نبوت، بہائیت اور بابیت کے نام پر ملحدین اسی طرح قومیت اور وطنیت کے نام پر بے دین اور دہریہ، تحقیق وریسرچ کے نام پر تحریک استشراق Orientilism، روشن خیالی، آزادی، ترقی پسندی اور راہ اعتدال کے نام پر اباحیت پسند طبقہ اور مغربیت زدہ طبقہ، غالی تصوف کے نام پر بدعت کا شکار طبقہ، عدم تقلید کے نام پر اسلاف بیزار اور منکرین تقلید، تنقید سے کوئی بالا تر نہیں کے عنوان سے خارجیت جدیدہ اور ناصبیت وغیرہ، ان سب نے بھی تفسیر، حدیث، فقہ اور سیرت پر قلم اٹھا یا، اور پھر اپنے قلم کی جولانیاں جو دیکھائی وہ کسی پر مخفی نہیں، مگر الحمد للہ علما نے اس کا بھر پور تعاقب کیا، اور اللہ نے، {انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون} کے وعدے کو اہل حق علما کے ذریعہ پورا کیا، بلکہ معاملہ اسی پر نہیں تھمتا ہے کہ اسلاف بیزاروں کے نتیجے میں فرق جدیدہ وجود میں آ گئے، اس پر مستزاد بڑی مصیبت یہ کہ مستشرقین اور اہل کتاب کی طرف سے اسلام پر کیے گئے شکوک وشبہات کا دفاع کرنے کے لیے بھی، ایسے لوگ وجود میں آئے کہ جنہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں ان کے اعتراضات کا جواب دیا، کیوں کہ یہ لوگ صحیح اسلامی تعلیمات سے ناواقف تھے، یا تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے تھے، اور اپنے آپ کو کامل اور شیخ الکل فی الکل سمجھ رہے تھے ،لہٰذا کام اور بڑھ گیا، کیوں کہ ایک طرف تو علما حق کو اہل کتاب اور مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دینا ہوتا تھا اور دوسری طرف ان جدت پسندوں کی بے اعتدالیوں کو طشت از بام کرنا ہوتا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ جدت پسندوں کے اسلاف خاص طور پر محدثین فقہا اور متکلمین اور فقہ، اصول فقہ، علم کلام، علم حدیث پر اٹھائے گئے اعتراضات کا بھی جواب دینا ہوتا ہے، مگر الحمد للہ "**لا تزال طائفة من امتی منصورین علی الحق لا یضرھم من خذلھم**"

والے فرمان رسول کے مطابق محاذ پر طائفۂ منصورہ حق کا بھرپور دفاع کرر ہا ہے، اور قیامت تک انشاء اللہ کرتا رہے گا۔ اللہم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔ آمین

جب میں نے سال گزشتہ سیرت پر مواد جمع کرنا شروع کیا، تو ایسی بہت سی تحریر نظر سے گزری، جس میں بے اعتدالیاں اور جادۂ حق سے انحراف پایا گیا، تو میں نے حکیم فخر الاسلام صاحب سے کہا کہ وہ شبلی اور سرسید کی سیرت کے بارے میں بے اعتدالیوں کو قلم بند کردیں، تو الحمد للہ انہوں نے بہ حسن خوبی اس کام کو انجام دیا، چونکہ برصغیر کی جدت پسندی کو...... بے اعتدالیوں کے لیے اصول ان ہی دو حضرات سے فراہم ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان پر اگر نظر ہو جائے تو باقی جدت پسندوں کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، اللہ حکیم صاحب کو اجر عظیم سے نوازے مقالہ کا کچھ حصہ شامل ہے بقیہ انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں، سیرت کے موضوع کی وسعت کو دیکھ کر، ہم نے سیرت پر دو شمارے نکالنے کا ارادہ کیا، پہلا علم سیرت پر اور دوسرا سیرت پر، علم سیرت پر جو شمارہ ہے گویا وہ مقدمات سیرت پر مشتمل ہے، جس میں:

(۱)......سیرت کی لغوی واصطلاحی تعریف

(۲)......سیرت کیا ہے؟

(۳)......مطالعہ سیرت کے اغراض ومقاصد

(۴)......عظمت سیرت نبوی

(۵)......سیرت کی ضرورت

(۶)......سیرت کی ابدیت

(۷)......خصائص سیرت نبوی

(۸)......مقام خاتم الانبیا والمرسلین

(۹)......مصادر سیرت نبوی

(۱۰)......سیرت نگاری کی تاریخ

(۱۱)......سیرت کے مناہج واسالیب

(۱۲)......سیرت نگاری کے منحرف مناہج

(۱۳)......تجدد پسندوں اور سیکولروں نے سیرت نگاری کیوں کی؟

(۱۴)......سیرت نگاری کے اصول وضوابط

(۱۵)......شمس العلما شبلی نعمانی اور سر سید احمد خاں کے افکار نبوتِ محمدی اور سیرت نبوی کے حوالہ سے

اس طرح مقدمات سیرت کو علم سیرت ایک تعارف کے عنوان سے ،خصوصی شمارہ آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہے، اوراب دوسرا انشاء اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ''سیرت طیبہ'' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال، اخلاق اور آثار پر مبنی ہوگی۔

اس شمارے میں جومواد ہے وہ اکثر ''السیرۃ عالمی'' کے تقریباً ۲۳ رشماروں اور تعمیر افکار کا سیرت نمبر اور نقوش کا سیرت نمبر اور کچھ عربی ویب سائٹوں اور عربی کتابوں سے ترجمہ کرکے تیار کیا گیا ہے، جس میں مفتی عبدالمتین صاحب اشاعتی معین مفتی شعبہ افتاء جامعہ ھٰذا نے بعض عربی مضامین کے ترجمہ میں، منیجر شاہراہ علم مفتی ہلال صاحب نے تلخیص میں اور صدر دارالافتاء مفتی محمد جعفر صاحب نے پروف ریڈنگ میں بڑا تعاون کیا۔ **فجزاھم اللہ خیر الجزاء واحسن الجزاء فی الدارین وزادھم اللہ علما وفضلا وصلاحا وفلاحا وتقبل اللہ منا ومنھم۔**

السیرۃ عالمی اور تعمیر افکار کے مجلّات میں، چونکہ مقالہ نگار کے صائب رائے ہونے کا اہتمام نہیں ہے، تو بندے نے بالاستیعاب تمام مقالات ومضامین کو پڑھا اور جو مخدوش چیزیں نظر سے گزری اسے حذف کردیا، بہت سے مقالات تو مکمل مخدوش تھے، لہٰذا ان کی اشاعت عام مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں تھی اسے حذف کردیا گیا، پھر بھی اگر کہیں کوئی چیز کسی قاری کی نظر سے گزرے تو مطلع کرنے کی زحمت فرمائے، انشاء اللہ آئندہ شمارے میں وضاحتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا جائیگا، بلکہ ناکارہ خود بھی ایک بار پھر غور سے دیکھکر اگر کوئی چیز اصول اہل سنت کے معارض یا مخدوش دیکھے گا تو نشاندہی کردیگا۔ السعی منا والاتمام من اللہ۔

مستشرقین کے سیرت پر اعتراضات اور اس کا رد کے عنوان پر ایک مقالہ اس شمارے کا حصہ ہونا چاہئے تھا مگر ممکن نہ ہوسکا، انشاء اللہ آئندہ شمارہ ''سیرت نبویہ'' میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

☆......☆......☆

انسانی زندگی میں دین اور نبی کی ضرورت

اللہ رب العزت نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا، اور یہ بات مسلم ہے کہ اللہ کی ذات حکیم و دانا ہی نہیں بلکہ حکمت و دانائی کی خالق و مالک ہے، اور مقولہ مشہور ہے: "**فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ**" کہ دانا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا، لہٰذا اللہ رب العزت کے کسی بھی کام کے حکمت سے عاری ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اب جب یہ بات ثابت ہوگئی تو یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اللہ نے کائنات کی کسی بھی چیز کو بے سود پیدا نہیں کیا، بلکہ ہر چیز کسی نہ کسی مقصد ہی کے تحت پیدا کی گئی، اور اللہ تعالیٰ نے مخدوم و متبوع حضرت انسان کو بھی کسی مقصد ہی کے تحت پیدا کیا ہے، اور اس کی خدمت کے لیے دیگر مخلوقات کو بھی جداگانہ مقاصد سے وجود بخشا۔

قرآن کریم جو کلامِ الٰہی ہے، جس کا نزول نبی آخر الزماں، محمد مصطفی، احمد مجتبیٰ ﷺ پر وحی بالمعنی کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت کے لیے ہوا، جس نے انسان کو اس کی زندگی میں پیش آنے والے تمام مسائل کو حل کیا، چاہے اعتقادی مسائل ہوں، معاشی مسائل ہوں، معاشرتی مسائل ہوں، چاہے سماجی مسائل۔ لہٰذا یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اُس نے اِس اہم موضوع سے تعرض نہ کیا ہو، جس کو مقاصد سے تعبیر کیا جاتا ہے، مقاصد ہی تو وہ محور اور نقطے ہوتے ہیں جن کے اردگرد پورے مسائل گھومتے رہتے ہیں، کیوں کہ انسان مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کسی بھی مسئلہ کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ جو کام کر رہا ہے، وہ نفع بخش ہے یا نہیں، کہیں اس سے نقصان نہ ہو جائے۔

اور اللہ تعالیٰ نے جو عقل عطا کی، اس کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اس کو اس طرح سوچنا چاہئے، مگر یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ وہ محض اپنی عقل کے بل بوتے پر مسائل کا صحیح حل نہیں کر سکتا، کچھ مسائل جو چھوٹے ہوں، وہ حل کرے تو کرے، ورنہ اکثر مسائل تو حل نہیں ہو سکتے، اس کے لیے وحی کی ہی ضرورت ہے۔

اسی مقصد کی خاطر آدم علیہ السلام سے لے کر نبی کریم ﷺ تک کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا، انبیاء نے اسی مشن کو آگے بڑھایا اور انسان کو بتلایا کہ تیری زندگی، اور تیرے علاوہ اللہ کی دیگر مخلوقات کی زندگی کا مقصد کیا ہے، ایک طرف تو ہے اور دوسری طرف تیرے ماسوا تمام

مخلوقات، تو قرآن کریم نے صاف الفاظ میں کہہ دیا: {وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنْسَ إلا لِيَعْبُدُوْنِ} کہ میں (اللہ تعالیٰ) نے جنات اور انسان کو صرف اور صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔ [الذٰریٰت: ۵۶]، اور دوسری آیتِ کریمہ میں فرمایا: {هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِيْ الأَرْضِ جَمِيْعًا} وہ وہی (خدا) ہے، جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب۔ [البقرۃ: ۲۹]

الغرض یہ بات معلوم ہوگئی کہ انسان متبوع اور اصل ہے، پوری کائنات اس کے تابع ہے، انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا، اور دیگر تمام مخلوقات انسان کی خدمت کے لیے پیدا کی گئیں، یہی سبق انبیاء کرام علیہم السلام نے انسانوں کو دیا، لہٰذا اس کا سر سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہونا چاہئے، ورنہ قلبِ موضوع لازم آئے گا۔

نبوت کی ضرورت:

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی وقفے وقفے سے بعثت یہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا انعام واکرام ہوا، کیوں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کی ضرورت قدم قدم پر پڑتی ہے، اور وہ نبیوں کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ خالق ومالک، رحیم وکریم ہونے کی وجہ سے انسان کی مکمل وصحیح رہنمائی کرسکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی اس کی مکمل وصحیح رہنمائی نہیں کرسکتا، اور یہ بھی مناسب نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے پاس آکر اُس سے گفتگو کرے، اس کو ہدایات دے، جیسے بادشاہ بذاتِ خود اپنی رعایا کے پاس نہیں جاتا، مگر محل میں بیٹھے ہوئے مختلف لوگوں کے ذریعہ سب کے کام کرواتا ہے، تو بالکل اسی طرح انبیاء کرام یعنی ہر زمانہ میں کچھ مخصوص افراد کو اللہ مبعوث فرماتے اور ان کے ذریعہ لوگوں کے مسائل کو حل کرتے رہے، کیوں کہ انسان کو کھانے پینے سے زیادہ اس چیز کی ضرورت ہے کہ اسے عبادت کا طریقہ معلوم ہو، اسے معاشرت ومعیشت کے مسائل معلوم ہو، تاکہ سلیقے سے زندگی گذار سکے، اور انبیاء انسان کو خود اس کے اپنے اور اللہ کے بارے میں، حلال وحرام اور اللہ کے پسندیدہ امور کے بارے میں مطلع کرتے ہیں۔

بعض مفکرین کا کہنا ہے کہ جیسے بدن صحت منداور بیمار ہوتا ہے، اور بیماری کی صورت میں اسے طبیب کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح انسان کی روح کا حال ہے، اور وہ چوں کہ مخفی ہے، لہٰذا اس کا علاج اللہ کے بیان کردہ طریقے کے مطابق حضراتِ انبیاء کرام کے ذریعہ ہوسکتا ہے، باطل کی صلاح پر دنیا قائم ہے، جس دن زمین پر بسنے والے بلا استثناء تمام انسانوں کے باطن اور روح اللہ کے ذکر سے ویران ہوجائیں گے، اس دن قیامت قائم

ہو جائے گی، اور یہ امر، امرِ مسلم ہے۔

دین کے بغیر زندگی:

دین کے بغیر زندگی ایسی ہے جیسے منزل کے بغیر سفر، ایک آدمی بہت عالی شان جہاز تیار کرے، اس میں عیش وعشرت اور ضروریات زندگی کے تمام اسباب، مثلاً بیت الخلاء، سونے کے لیے عمدہ چارپائی، کھیل کود کے لیے میدان، سب کچھ موجود ہوں، اور وہ لوگوں سے کہے کہ آؤ ہم چلتے ہیں، تو لوگ سوار ہونے سے پہلے اس سے دریافت کریں گے کہ ہمارے اس سفر کی آخری منزل کونسی ہوگی؟ اور ناخدا منزل کی لاعلمی کا اظہار کرے، تو کیا کوئی اس کے جہاز میں سوار ہوگا؟ بالکل اسی طرح ایمان اور بغیر ایمان والی زندگی کا حال ہے، ایمان والے کی زندگی ہدف اور منزل کی طرف ہوتی ہے، اور بغیر ایمان کے زندگی گذارنے والے کا کوئی ہدف اور کوئی منزل نہیں ہوتی، کیوں کہ ایمان والے کو یقین ہے کہ مرنے کے بعد اللہ کے روبرو حاضر ہونا ہے، اس دنیوی زندگی کا حساب دینا ہے، اچھائی کا بدلہ اچھا، اور برائی کا بدلہ برا ملے گا، جس کا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان ہی نہیں، اس کے سامنے کچھ نہیں کہ مرنے کے بعد مٹی یا راکھ ہو جائیں گے، کوئی حساب وکتاب نہیں ہوگا، تو ظاہر سی بات ہے وہ بالکل لااُبالی پن میں زندگی گذارے گا، جو اپنی سمجھ میں آئے گا، چاہے وہ اچھا ہو یا برا کرتا رہے گا، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے ایمان کی قدر دانی کی توفیق مرحمت فرمائے، اور ایمان کے مطابق زندگی گذار کر ایمان پر خاتمہ فرمائیں۔ آمین!

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان والی زندگی ہی صحیح معنی میں انسان کی زندگی ہے، اسی لیے حضراتِ انبیاء علیہم السلام ایمان کو لے کر آئے، اس کے تقاضوں سے لوگوں کو باخبر کیا، اور عملی طور پر خود بھی ایمان کے تقاضوں کے مطابق زندگی گذار کر بتلائی، لہٰذا انسان کے لیے اپنے مقصد کو پیش نظر رکھ کر زندگی گذارنے کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرتوں کا مطالعہ از حد ضروری ہے، خاص طور پر خاتم الانبیاء والمرسلین کی سیرت کا مطالعہ تو فرض کے درجہ میں ہے، کیوں کہ قرآن کا اعلان ہے: {لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ} "تحقیق کہ تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ) کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔" [الاحزاب:۲۱]

حضرات صحابہ نے حضور اقدس ﷺ کے ہر ہر موقع کے کردار اور طرز عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، پھر اس کے مطابق اپنی زندگی کے لیے نمونہ بن کر اُبھرے، ان تمام چیزوں سے لوگوں کو مطلع بھی کیا، اور اسی کو سیرت کہا جاتا ہے، گویا سیرت کے مطابق زندگی گذار کر کامیابی حاصل ہوتی ہے، اس کی مثال حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم قائم کر گئے، تو آیئے! اب ہم بھی اولاً "مقدماتِ سیرت" کے عنوان سے سیرت کے متعلق چند ضروری اور بنیادی امور کو سپرد قرطاس کرتے ہیں، اور پھر مختصراً "سیرتِ رسول ﷺ" پر روشنی ڈالیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ!

صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم

سیرت کی لغوی واصطلاحی تعریف

لغوی تحقیق: لفظ "سیرت" اسم ہے، اور فعل "سَارَ یَسِیْرُ" (باب ضَرَبَ یضرِبُ) بمعنیٰ چلنا، جانا، سفر کرنا، سے نکلا ہے۔ قرآن مجید میں فعلِ ماضی "سَارَ" کا استعمال سورۂ قصص میں اس طرح آیا ہے:

{فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الأَجَلَ وَسَارَ بِأَھْلِهٖ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا}۔

"غرض جب موسیٰ اس مدت کو پوری کر چکے اور (باجازت شعیب علیہ السلام) اپنی بی بی کو لے کر (مصر یا شام کو) روانہ ہوئے تو ان کو کوہِ طور کی طرف سے ایک (روشنی بشکل) آگ دکھائی دی۔" [قصص:۲۹]

فعل مضارع "یَسِیْرُوْا" کا استعمال قرآن مجید میں سورۂ روم میں اس طرح آیا ہے:

{أَوَ لَمْ یَسِیْرُوْا فِي الأَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کَانُوْا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً}۔

"کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، جس میں دیکھتے بھالتے کہ جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں ان کا انجام کیا ہوا، وہ ان سے قوت میں بڑھے ہوئے تھے۔" [روم:۹]

"سَارَ یَسِیْرُ" کا مصدر عربی میں پانچ طرح آیا ہے: "سَیْرًا، تَسیارًا، مَسِیرًا، مَسِیرَة اور سَیْرُوْرَة"۔

مصدر "سیرًا" کا استعمال سورۂ طور میں قیامت کے سلسلے میں اس طرح آیا ہے:

{وَتَسِیْرُ الْجِبَالُ سَیْرًا} "اور پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے۔" [طور:۱۰]

فعل "سَارَ" کو جب "السنة" کے ساتھ استعمال کریں، مثلاً کہیں: "سَارَ السّنَّة" تو اس کے معنی ہوتے ہیں: "سلکھا وعمل بھا" (وہ اُس کے طریقے پر چلا اور عمل کیا) مثلاً عربوں کا یہ قول: "اوّل راضی سنّة من یسیرھا" (کسی طریقہ پر راضی ہونے والا پہلا وہ شخص ہے جو اس پر عمل کرے)۔ اسی طرح جب عربی محاورہ میں کہتے ہیں: "سِر عنک"، جو درحقیقت مخفف ہے: "سِرْ وَدَعْ عنکَ الشّک والمراء" کا،

جس کے معنی ہوتے ہیں: ''چل! شک اور جھگڑا درگذر کر''۔ اسی طرح کہتے ہیں: ''اِستَارَ اِستِیَارًا بِسِیرَةِ فُلان'' جس کے معنی ہیں: ''مشیٰ علی خطّته و استنّ بسنّته''یعنی وہ اُس کے نقشِ قدم پر چلا اور اُس نے اس کا طریقہ اپنایا۔

تو جب فعل ''سَارَ یَسِیْرُ'' کے معنی ہوئے ''چلنا''، تو جو اسم (یعنی لفظ سیرت) اُس سے نکلا، اُس کے معنی ہوئے چال چلن، طرزِ زندگی، طریقہ، عادت، ہیئت، حالت، سوانح حیات، کسی شخص کے لوگوں کے ساتھ سلوک کی کیفیت، چناں چہ کسی شخص کی خوبی بیان کرتے ہوئے کہا جاتا ہے: ''هُوَ حَسَنُ السِّیْرَةِ'' (وہ اچھی عادات وکردار کا حامل ہے) یعنی لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک اچھا ہے۔ اسی سے عربی کی یہ مثل چلی: ''مَنْ طَابَتْ سَرِیْرَتُهٗ حمِدَتْ سِیْرَتُهٗ'' (جس کا باطن اچھا اور نیت اچھی، اس کا سلوک اچھا، اس کی سیرت اچھی)۔ قرآن مجید میں لفظ ''سیرت'' بمعنی ہیئت، سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں اس طرح آیا ہے کہ جب اُن کا عصا معجزہ کے طور پر دوڑتا ہوا سانپ بن گیا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُسے ہاتھ لیتے ہوئے قدرے خوف محسوس ہوا، تو ان سے ارشاد ربانی ہوا:

{خُذْهَا وَ لَا تَخَفْ سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْأُوْلٰی}

''اس کو پکڑ لو اور ڈرو نہیں، ہم اُس کو ابھی اُس کی پہلی سیرت (ہیئت وحالت) پر کر دیں گے۔'' [طٰہٰ: ۲۱]

سیرت جسے عربی میں '' السیرۃ'' لکھا اور پڑھا جاتا ہے، عربی زبان کا لفظ ہے، اور اس سے فعل ''سَارَ یَسِیْرُ سَیْرًا و مسیرًا و مسیرۃ و سیرورۃ'' (باب ضرب یضرب) مستعمل ہے، بمعنی چلنا، پھرنا، جانا سفر کرنا، عمل کرنا، مشہور ہونا۔

''السیرۃ'' اسی ''سَارَ یَسِیْرُ'' کا اسم ہے، جس کا استعمال مختلف معانی کے لیے ہوتا ہے، مثلاً روش، طور طریقہ، چال چلن، ڈھنگ، طرزِ زندگی، کردار، سنت، عادت، شکل وصورت، ہیئت، حالت، کہانی، قصہ، واقعہ۔

(عبدالحفیظ بلیاوی: مصباح اللغات؛ص/ ۴۱۰، ۴۱۱، المعجم الاعظم: ۳/ ۱۴۸۷)

صاحب تاج العروس محمد مرتضیٰ الزبیدی نے بھی ''السیرۃ'' کے یہی معانی بیان کئے ہیں۔

(تاج العروس: ۳/ ۲۸۷، ۲۸۸)

علامہ مجدالدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی ''القاموس المحیط'' میں لکھتے ہیں:

''السیرۃ بالکسر السنة و الطریقة و الهیئة و المسیرۃ'' السِیرۃ ''س'' کے زیر کے ساتھ سنت، طریقہ، ہیئت اور مسافت کے معنوں میں مستعمل ہے۔ (۲/ ۵۴، دار المعرفة بیروت)

ابن منظور افریقی ''لسان العرب'' میں لکھتے ہیں کہ:

"سیرًا" کے معنی چلنے اور رخصت ہونے کے آتے ہیں، جیسے حدیث حذیفہ (رضی اللہ عنہ) میں ہے: "تسایر عنہ الغضب" اس سے غصے کے آثار رخصت ہو گئے۔ اس کے علاوہ "سیرۃ" کا لفظ مسافت کے معنی میں بھی مستعمل ہے، اور "السیارۃ" کے معنی قافلہ کے ہیں، نیز "السیرۃ" کے معنی ہیئت اور حالت کے بھی آتے ہیں۔ [۳۹۰،۳۸۹/۴] (ملخص از السیرۃ عالمی: ص/۲۱ تا ۲۲، شمارہ نمبر: ۳)

سیرت کے معنی لغوی کے سلسلہ میں یہ تحقیق تھی سید محبوب حسن واسطی اور مولانا اکرام اللہ جان قاسمی کی، اب سیرت کی اصطلاحی تعریف کرتے ہیں:

اصطلاحی تعریف:

مصدر "سیرًا" اور اسم "سیرت" کے بالترتیب لغوی معنی چلنا اور چال چلن ہیں، اصطلاحی ومعروف معنی طرزِ عمل، طریقہ، معاملہ، کردار، صلح وجنگ کے متعلق اسلام کا مخصوص طریقہ، غیر مسلموں کے ساتھ اسلام کا بین الاقوامی قانون، اور اخیراً سیرت بمعنی سوانح حیات کی طرف انتقالِ معنیٰ مختلف مراحل میں ہوا۔

ابتداءً: "سیرًا" سے مراد: "السیر إلی الغزو" (اسلامی فوج کا جنگ کے لیے جانا) ہوتا تھا۔ چناں چہ اسلامی غزوات اور جنگوں کے بیان کے لیے جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، انہیں "کتاب المغازی" یا "کتاب السیر" (س کا زیر اور یٰ کا زبر۔ سیرت کی جمع) کا نام دیا جاتا تھا۔ حضرت ابن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) محمد بن اسحق (م ۱۵۱ھ) اور عمر بن راشد الازدی (م ۱۵۲ھ) کی "کتاب المغازی"، اور بعد کے دور میں محمد بن عمر الواقدی کی کتاب "التاریخ والمغازی"، ابن عبد البر کی "الدرر فی اختصار المغازی والسیر" اور سلیمان بن موسیٰ الکلاعی الاندلسی کی "الاکتفاء فی مغازی رسول اللہ" سیرت کی ایسی ہی چند کتابیں ہیں، جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کا تفصیلی بیان ہے، بعد کے ادوار میں لفظ "سیرت" کے مفہوم میں قدرے توسیع ہوئی، اور سیرت کی کتابوں میں امام وقت کا، غازیوں، اسلامی فوج اور دشمن فوج کے ساتھ مختلف سلوک اور ان سے مختلف معاملات کا بیان کیا جانا شروع ہوا (سیر الإمام ومعاملاتہ مع الغزاۃ والأنصار والکفار) دورانِ جنگ دشمن کے مختلف طبقوں مثلاً کافر، باغی، طالبِ امن (مستامن)، مرتد، ذمی وغیرہ کے ساتھ مختلف نوعیت کے سلوک کے بیان کے لیے لفظ "سیرت" استعمال کیا جانے لگا۔

حافظ عبد المومن الدمیاطی کی "سیرت دمیاطی"، شیخ ظہیر الدین گازرونی کی "سیرتِ گازرونی"، علامہ

مغلطائی کی ''سیرت مغلطائی'' اور ابن عبد البر الاندلسی کی ''سیرتِ ابن عبد البر'' اس کی چند مثالیں ہیں۔

اہلِ فقہ نے اس کے مفہوم میں کچھ تبدیلی کر کے لفظ ''سیرت'' بین الاقوامی قانون کے لیے استعمال کرنا شروع کیا، چناں چہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مشہور شاگرد، حضرت امام محمد بن الحسن الشیبانی رحمہ اللہ نے ''کتاب السیر الکبیر'' اسی معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھی، یعنی جنگ وصلح میں مسلمانوں کا دیگر اقوام وملل کے ساتھ معاملہ وطریقہ۔

بعض محدثین نے مخصوص مضامینِ سیرت کو شمائل وخصائل کے نام سے ترتیب دیا، اور حضور ﷺ کے سراپا، حالات و عادات اور کریمانہ اخلاق کی حد تک سیرت کے مضامین کو مخصوص کر دیا، محمد بن عیسیٰ الترمذی (صاحبِ ترمذی شریف) کی ''الشمائل النبویہ والخصائل المصطفویہ'' اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔

اخیراً: ''سیرت'' کے مفہوم میں مزید توسیع ہوئی، اور یہ کسی اہم تاریخ ہستی کے کارناموں اور اس کی سوانح حیات کے لیے استعمال ہونے لگا، جس میں اس اہم ہستی کے ذاتی حالات، اس کے عادات وخصائل، اس کا معاشرتی، علمی یا سیاسی مقام، اس کی تعلیمات کے مثبت اثرات اور ان کے نتیجہ میں ظہور پذیر معاشی، معاشرتی یا سیاسی تبدیلیاں وغیرہ جملہ امور پر روشنی ڈالی جانے لگی۔ شبلی نعمانی کی ''سیرت النبی ﷺ'' یا ''سیرت النعمان'' محمد ادریس کاندھلوی کی ''سیرت المصطفیٰ ﷺ'' حبیب الرحمن خان شروانی کی ''سیرت ابوبکر صدیق'' قاضی سراج الدین احمد کی ''سیرت فاروق'' سید سلیمان ندوی کی ''سیرت عائشہ'' عبد السلام ندوی کی ''سیرت عمر بن عبد العزیز'' شاہ معین الدین احمد ندوی کی ''سیرت الصحابہ'' سعید انصاری کی ''سیرۃ الصحابیات'' قاضی اطہر مبارک پوری کی ''سیرت اربعہ'' اور طالب ہاشمی کی ''سیرت سعد بن ابی وقاص'' اس کی چند مثالیں ہیں۔

(السیرۃ عالمی: ص/ ۲۳ تا ۲۴، شمارہ: ۱)

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ''عجالہ نافعہ'' میں فرماتے ہیں: ''آنچہ متعلق بہ وجود پیغمبر ما ﷺ وصحابہ کرام وآل عظام است، واز ابتدائے تولد آں جناب تا غایتِ وفات، آں را سیرت گویند''

''وہ حدیثیں جو ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ، صحابہ کرام اور اہل بیت عظام سے متعلق ہیں، اور سرورِ کائنات ﷺ کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات پر مشتمل ہیں وہ ''سیر'' کے نام سے موسوم ہیں۔'' (عجالہ نافعہ مع شرح فوائد جامعہ از مولانا عبد الحلیم چشتی: ص/ ۴۸)

اکثر محدثین ''مغازی'' و''سیر'' کو ایک ہی چیز گردانتے ہیں، اور یہ اس لیے کہ ابتداءً ''سیر'' سے مراد صرف غزوات لیے جاتے تھے، اور اس کے مفہوم میں ابھی زیادہ وسعت نہیں آئی تھی، چناں چہ ابن اسحاق کی

مشہور کتاب کو"سیرت ابن اسحاق" بھی کہا جاتا ہے، اور"مغازی ابن اسحاق" بھی ، اسی طرح حافظ ابن حجر العسقلانی نے"فتح الباری" میں"کتاب المغازی" کے لیے" **الجهاد و السير**" کے عنوان سے باب باندھا ہے۔

سیرت کی مذکورہ اصطلاحی تعریفات کو مدنظر رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے تمام حالات، واقعات، غزوات، شمائل واخلاق، پسند وناپسند فرمودات اس سے متعلقہ اقوال، افعال وتقریرات، ازواج مطہرات، اہل بیت عظام، صحابہ کرام اور غیر مسلموں کے ساتھ تعامل ومعاملات، بلکہ زمانہ قبل پیدائش وبعد وفات کے وہ واقعات جن کا تعلق آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہے"سیرت" کہلاتے ہیں۔

سیرت کی حدود وقیود:

مسلمان علماء کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ جب وہ کسی علم یا فن کی تعریف بیان کرتے ہیں، تو یہ تعریف ایسی جامع ومانع ہوتی ہے جس سے اس علم یا فن کی حدود خود بخود متعین ہوجاتی ہیں، اس تعریف سے اس علم وفن کا نہ کوئی فرد باہر رہ سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی باہر کا فرد اس میں داخل ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تعریف کو اہل علم کے ہاں" حد" بھی کہا جاتا ہے، چناں چہ سیرت کی مذکورہ تعریفات کی روشنی میں سیرت کی حدود بھی متعین ہوجاتی ہیں، یوں کہا جاسکتا ہے کہ سیرت مندرجہ ذیل پہلوؤں پر مشتمل ہے:

۱- وہ تمام واقعات جو رسول اکرم ﷺ کی پیدائش سے قبل کے ہیں، اور آپ ﷺ سے متعلق ہیں، مثلاً عبد المطلب کا حضرت عبد اللہ کو ذبح کے لیے پیش کرنا، اور پھر ان کی جگہ سو اونٹ فدیہ میں ذبح کرنا، جس کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "**أنا ابن الذبيحين**" میں دو ذبیحوں کی اولاد ہوں، ایک حضرت اسماعیل علیہ السلام اور دوسرے حضرت عبد اللہ۔ (سیرت محمد ابن ہشام: ۱/۱۵۱ تا ۱۵۵)

۲- وہ تمام واقعات جو آپ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت خصوصی طور پر ظہور پذیر ہوئے، مثلاً ایوانِ کسریٰ کے کنگورے گرنا، مجوس کے آتش کدہ کا ٹھنڈا ہونا، بحیرہ ساوہ کا خشک ہونا، اور اس کے گرجے منہدم ہونا۔ (مختصر سیرۃ الرسول، محمد بن عبد الوہاب نجدی: ص/ ۱۲)

۳- وہ تمام حالات وواقعات جو آپ ﷺ کی پیدائش کے بعد نبوت ملنے تک آپ ﷺ کی ذات کے حوالہ سے وقوع پذیر ہوئے، مثلاً آپ ﷺ کی رضاعت وحضانت، واقعہ شق صدر، بحیرا راہب کی پیش گوئی، جنگ فجار، حلف الفضول، حجر اسود کی تنصیب، آپ ﷺ کا سفر شام، حضرت خدیجہ سے شادی اور غارِ حرا میں تعبد وغیرہ۔ (الرحیق المختوم، صفی الرحمن مبارکپوری: ص/ ۸۰، وبعدہٗ)

۴- نبوت سے لے کر وفات تک کے سارے حالات، واقعات، شمائل واخلاق، عادات و کردار،

معمولات، حلیہ ومزاج، خانگی وبیرون خانہ زندگی میں تعامل ومعاملات، پسند و ناپسند فرمودات، عزیزوں، رشتہ داروں، خادموں، دوستوں، دشمنوں، مخالفوں، بت پرستوں، مجوسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ برتاؤ وسلوک وغیرہ۔

۵- وہ تمام حالات وواقعات جو آپ ﷺ کی وفات کے بعد وقوع پذیر ہوئے، اور آپ ﷺ سے متعلق ہیں، مثلاً آپ ﷺ کی تجہیز وتکفین اور تدفین، جیشِ اسامہ کی روانگی (کیوں کہ اس کی تشکیل آپ ﷺ نے فرمائی تھی) اور آپ ﷺ کے متروکات وغیرہ کا بیان۔ (ملخص از السیرۃ عالمی: ص/ ۲۴ تا ۲۹، شمارہ نمبر: ۳)

فن حدیث وفن سیرت میں فرق:

حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری اپنی کتاب "اصح السیر" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"اصحابِ حدیث دراصل تین امور کو جمع کرتے ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا؟

(۲) رسول اللہ ﷺ نے کیا کام کیا؟

(۳) رسول اللہ ﷺ کے سامنے، یا رسول اللہ ﷺ کے وقت میں کیا کیا گیا؟

اصحابِ سیرت بھی انہی تین امور کو جمع کرتے ہیں، اس لیے اصل کام دونوں کا ایک ہے، مگر باوجود اس کے دونوں میں بڑا فرق ہے، اصحابِ حدیث کا مقصود بالذات احکام کو جاننا ہوتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی ذات سے ان کی بحث ضمناً ہوتی ہے، اور اصحاب سیر کا مقصود بالذات رسول اللہ ﷺ کو جاننا ہے، احکام پر ان کی بحث ضمناً ہوتی ہے، اس لیے محدثین کا مدارِ بحث یہ ہوتا ہے کہ یہ فعل یا قول، رسول اللہ ﷺ کا ہے یا نہیں؟ ان کی تمام تر قوت اس تحقیق پر صرف ہوتی ہے کہ اس قول یا فعل کا انتساب رسول اللہ ﷺ کی طرف صحیح ہے یا نہیں؟ لیکن اصحابِ سیرت کو یہ بھی کرنا پڑتا ہے، اور اس کے سوا اس کے ساتھ دو باتیں اور معلوم کرنی پڑتی ہیں، ایک یہ کہ حضور ﷺ نے کب ایسا کہا یا کیا؟ دوم یہ کہ ایسا کہنے یا کرنے کی وجہ کیا ہوئی؟ اصحابِ سیرت حضور ﷺ کے اقوال وافعال کو مسلسل اور مربوط بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کے اسباب وعلل کو بھی جاننا چاہتے ہیں، اصحابِ حدیث کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے، جب صحت کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ فعل رسول اللہ ﷺ کا ہے، تو وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کا طریقہ ہو گیا، گو یہ نہ معلوم ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے کب، کس دن، کس تاریخ کو ایسا کہا یا ایسا کیا؟ (ملخص از السیرۃ عالمی: ص/ ۲۹ تا ۳۰، شمارہ نمبر: ۳)

، کہ رسول اللہ ﷺ کے وجودِ گرامی سے جو کچھ بھی متعلق ہے، آپ کے صحابہ کرام، اہلِ بیت اور آلِ عظام سے جو بھی چیز تعلق رکھتی ہے، رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ مبارکہ سے لے کر آپ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے تک، ان سب کی تفصیل کو اسلامی علوم وفنون کی اصطلاح میں سیرت کہتے ہیں۔

سیرت یعنی حضور ﷺ کا رویہ اور طریقہ کار، گویا قرآن مجید پر عمل کرنے کا طریقہ کار ہے، اگر قرآن صامت اللہ کی کتاب ہے اور انسانوں کے عمل کے لیے ہے، تو اس پر عمل کرنے کا طریقہ کار بھی انسانوں کے سامنے آنا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے محض نظری ہدایت پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ اپنی رحمتِ کاملہ اور فضلِ عمیم سے ایک عملی نمونہ بھی بھیجا، جس کو آج ہم "سیرت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

قرآن پر عمل کرنے کا طریقہ کار اور قرآن مجسم کا رویہ جو قرآن نے کہا، وہ حضور ﷺ نے کیا، اور جو حضور ﷺ نے کیا وہ قرآن نے کہا، ان دونوں میں گہری نسبت پائی جاتی ہے، بلکہ بارہا ایسا بھی ہوا کہ جو حضور ﷺ نے چاہا وہ قرآن نے کہا، اس کی مثالیں بھی خود قرآن پاک میں موجود ہیں: {قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِي السَّمَآئِ} [البقرۃ:۱۴۴] حضور ﷺ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میرے دادا ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کا بنایا ہوا بیت اللہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قبلہ قرار پا جائے، قرآن پاک نے اس خواہش کو بھی ریکارڈ کر دیا، حالاں کہ اس کے بغیر بھی تحویلِ قبلہ کی یہ بات ہو سکتی تھی، اور بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا جا سکتا تھا، لیکن قرآن پاک میں یہ وضاحت کیا جانا کہ ہم آسمان کی طرف آپ کے چہرے کا بار بار اٹھنا دیکھتے تھے، اس بات کی دلیل ہے کہ تحویلِ قبلہ کے باب میں حضور ﷺ کی خواہش کی تکمیل اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کا تقاضا تھا۔

(محاضراتِ سیرت ﷺ: ص/ ۱۹ تا ۲۰)

یہ ہوئی سیرت کی تعریف لغۃً واصطلاحاً، اور حدیث وسیرت کے فرق کا بیان، اب آیئے! سیرت کے موضوع اور غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

سیرت نبوی کا موضوع:

ذات النبي ﷺ الشریفة وھیئة خلقه الأکمل وخلقه الأفضل وأحواله المنقیة التی ما قامت الشریعة ولا سخرت علومها الا تعلیق العباد بھا۔

سیرت کا موضوع نبی کریم ﷺ کی ذات شریفہ خلقت کاملہ اور اخلاق فاضلہ اور وہ احوال نبوی جس پر

شریعت کا پورا مدار ہے۔علوم سیرت کی تدوین ہی اس لیے عمل میں آئی کہ تا کہ اس پر اللہ کے بندوں کو ڈال دیا جاتا۔

☆......☆......☆

سیرت کیا ہے؟

ابومعاویہ ابوذر بخاری رحمہ اللہ سیرت کی حقیقت بڑے دقیق وعمیق انداز میں بیان کرتے ہیں:

سیرت ہے کیا؟ اصل سیرت نام ہے چال ڈھال کا، روش کا، زندگی گزارنے کے طریقے کا۔

سیرت کہتے ہیں: وہ ایک راستہ، انداز، وہ ڈگر، وہ اسلوب، وہ طریقِ کار، جس کے ساتھ کوئی آدمی اپنی زندگی گزارے، تو حضور ﷺ کی سیرت کیا ہوئی؟ آپ نے دنیا میں تشریف لانے کے بعد کس انداز سے زندگی گزاری؟ اس زندگی گزارنے کے انداز کا نام سیرت ہے، اب اسی انداز کو جب جمع کیا علماء نے تو وہ چوبیس لاکھ حدیثیں بن گئیں، جب ان کی تشریح کی تو پندرہ لاکھ فقہ کے مسائل بن گئے، اور اسی کو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں دیکھا تو تیس پارے بن گئے، تو یہ ہے سیرۃ الرسول ﷺ جب علماء نے جمع کی ڈیڑھ لاکھ صحابہ سے، تو چوبیس لاکھ حدیثیں وہ ہیں جو چھانٹ کر ایک طرف رکھ دیں کہ یہ صحیح ہیں، اور جو لوگوں نے جعلی گھڑی ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں، اور جب چاروں امام ان کی تشریح کرنے بیٹھے تو فقہ کے پندرہ لاکھ مسائل تیار ہو گئے، اور جب ان سب کو چھوڑ چھاڑ کے ایک طرف رکھا اور قرآن کو دیکھا تو تیس پارے بن گئے، یہ سیرت النبی ﷺ نہیں تو اور کیا ہے؟ اور یہ میں اپنی طرف سے مبالغہ نہیں کر رہا، میں بچپن میں سمجھا کرتا تھا اپنی جہالت کی وجہ سے کہ یہ علمائے کرام اس لیے نبی کی تعریف کرتے ہیں تا کہ ان کی بھی تعریفیں زیادہ ہوتی جائیں، لیکن نہیں! "النَّاسُ أَعْدَاءٌ لِمَا جَهِلُوْا" آدمی اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جس کی حقیقت سے بے خبر ہو۔ اگر ابوجہل محمد ﷺ کی حقیقت سے باخبر ہوتا، تو وہ پاؤں دھودھو کے پیتا، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب تک غافل رہے تلوار لیے پھرتے رہے، اور جب حقیقت سمجھ میں آ گئی، تلوار ہاتھوں میں تھی اور پاؤں میں گر گئے۔ آدمی جب تک بے خبر رہے کسی حقیقت سے اس کا دشمن ہوتا ہے، اور جب باخبر ہو جائے تو دشمنی محبت سے تبدیل ہو جاتی ہے، ابوجہل کا بیٹا صحابی ہے، اور باپ جہنمیوں کا سردار، ابوجہل کی بہو،

عکرمہ بن ابی جہل کی بیوی صحابیہ ہے، جب حقیقت سمجھ میں آ گئی تو پھر کیا ہوا؟ وہ عمر جو گھر سے تلوار لے کر نکلے تھے کہ آج معاذ اللہ محمد کا سر لے کر آؤں گا، اپنا سر دے کر آ گئے۔ اصل بات یہ نہیں، تلوار عمر کبھی نہ اٹھاتا، حضور ﷺ نے دعا کی تھی: "اللهمّ أعِزّ الإسلامَ بِعَمرو بن هشام أو بعُمرَ بن الخطاب" یا اللہ تیرا دین اسلام کمزور ہے، میری دانست میں، میرے عقل میں یہ بات آتی ہے کہ یہ دو نگینے مجھ کو مکے کی زمین کے دے دے، یا عمر دے دے یا ابو جہل، اسی لیے جب حضرت عمر ابن خطاب نے کلمہ پڑھا تو ان کا نام پڑ گیا، "دعاء الرسول" یہ رسول کی دعا مجسم ہو کر آئے، اور قبولیت کی حالت اس وقت طاری ہوئی جب عمر نے گھر سے تلوار نکالی، نبی کی دعا قبول ہوئی، اور نبی کی دعا پھر گھر سے چلی، آئی اور تیغ بدست آئی، اور جب آئے دارِ ارقم میں تو کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یہاں ہاتھ رکھ کر پوچھا: "أو لم تنته؟" ابھی باز نہیں آؤ گے؟ میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں، اتنا لفظ کہنے سے تلوار ہاتھ سے گر جانے کا کیا مطلب؟ اب کوئی گرا کے دکھا دے:

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! عمر آ گئے، آپ نے فرمایا: آنے دو، حضرت حمزہ بولے: اگر نیت بہ خیر ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ میں اس کو سمجھ لوں گا، دیکھیں گے کیا کرتا ہے، دروازے میں داخل ہوئے تو تیور دیکھے، حضور بھی کھڑے ہو گئے، صحابہ بھی کھڑے ہو گئے، وہ دارِ ارقم میں آئے، اب اس کے بعد جو ہونا تھا وہ اتنا ہی ہوا، دیکھ لو ایک مجرم کی حیثیت سے عمر ابن خطاب سامنے کھڑا ہے، لیکن پیغمبر کریم ﷺ اتنے حیادار، اتنے شرمیلے کہ عمر سامنے کھڑے ہیں، فرما سکتے تھے کہ "سب کچھ تو تو کر رہا ہے ابھی تو باز نہیں آیا"؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تو ابھی رکے گا نہیں؟ کیا ابھی رکنے کی کوئی صورت نہیں؟ کہنے لگے: یا رسول اللہ! آج تو میں رکنے کے لیے آیا ہوں، بس اس پر صحابہ نے نعرۂ تکبیر لگایا، صاف آتا ہے "فكَبَّرَ النّاسُ" صحابہ نے نعرہ لگایا، اور اس سے دارِ ارقم کا پورا ماحول گونج اٹھا، اور مکے کے شہر والوں کو خبر ہو گئی کہ آج کوئی واقعہ ہوا ہے، اور چند منٹ کے بعد رسول اللہ ﷺ حضرت حمزہ، حضرت صدیق اکبر اور تمام وہ صحابہ جو ساتھ تھے، حضرت عمر کے اپنے بہنوئی سعید بن زید اور تمام جاں نثار عثمان ابن عفان، حضرت علی ابن ابی طالب یہ سب حضرات آپ کے جلو میں ہیں، اور وہی عمر جو بازار سے دارِ ارقم کی طرف تلوار لے کر حضور کو معاذ اللہ شہید کرنے جا رہے تھے، وہی عمر حضور ﷺ کے آگے آگے تلوار سونت کے آپ کی حفاظت کے لیے واپس آ رہے ہیں۔

اس سے پہلے درمیان میں حضور ﷺ سے حضرت عمر پوچھتے ہیں کہ یارسول اللہ! آپ یہاں کاہے کے لیے جمع ہوتے ہیں؟ یہ کیا بات ہے کہ مکان میں آپ بند ہیں؟ فرمانے لگے نماز پڑھنے کے لیے بیٹھے ہیں، کہنے لگے: آپ نماز باہر کیوں نہیں پڑھتے؟ کیا سبب ہے چھپ کر نماز پڑھنے کا؟ کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ کہنا تو چاہیے تھا کہ تو ہی تو پڑھنے نہیں دیتا اور پوچھتا بھی خود ہی ہے؟ لیکن نہیں؛ کلمہ پڑھنے والے خادم کو اپنی بات پر بھی شرمندہ نہیں کیا، فرمایا تو یوں فرمایا کہ تیری قوم نہیں پڑھنے دیتی! ان کی اطاعت فداکاری وصداقت کا اظہار ہو جانے کے بعد اب اس کہنے میں بھی حضور ﷺ شرم محسوس کرتے ہیں کہ کہیں اس کی دل شکنی نہ ہو جائے، اب پیغمبر اس کو شرمندہ کرتے تو پھر عام آدمی اور پیغمبر میں کیا فرق ہے؟ کہ جب کوئی حضور کی امت میں داخل ہو گیا، کلمہ طیبہ پڑھ کر سچے دل سے، تو پھر پیغمبر نے کبھی اسے پچھلے گناہوں کی یاد دلا کر ذلیل ورسوا نہیں کیا، اور یہیں اولیاء اللہ کو دیکھا عمل کرتے ہوئے، جب ان کے مریدوں میں کوئی شخص جو بدکار تھا، بدمعاش تھا، شرابی کبابی تھا، جب اس نے کبھی توبہ کر لی اور حلقے میں آ گیا، تو پھر اس کے مرتے دم تک بھی بزرگوں نے رسوا نہیں کیا، پیغمبر کی سنت پر عمل کرنے والوں کا وطیرہ یہ ہے کہ وہ پھر لوگوں کے گناہوں کی پردہ پوشی کیا کرتے ہیں، حضور ﷺ نے ایک لفظ بھی نہیں فرمایا، فرمایا تو یہ کہ تیری قوم نے روک رکھا ہے، کہنے لگے یارسول اللہ! پھر آج تو نماز صحنِ کعبہ میں ہوگی، عمر ابن خطاب مسلمان بھی ہو جائے، آپ کا ساتھ بھی دے، اور پھر آپ چھپ کر کے نماز پڑھیں، اب یہ نہیں ہوگا، فرمایا چلو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔

وہی نماز جس کو پڑھنے والے محمد ﷺ ہیں، اور پیچھے پڑھنے والے ابوبکر، عمر، عثمان، علی، جعفر، زبیر ابن عوام، ابوفکیہہ، عمار بن یاسر، زنیرہ، بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی ہیں، یہ لوگ جو حضور ﷺ کے پیچھے نماز یں پڑھتے تھے، آپ اندازہ کریں بہ ظاہر کتنا عجیب وغریب منظر ہے حضور کی سیرت کا کہ کیا معاذ اللہ پیغمبر کو اتنا ہی خوف تھا مخلوق خدا کا کہ وہ دارِ ارقم سے نکل کر صحنِ کعبہ میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے؟ نہیں، نہیں: تقدیرِ الٰہی میں صحنِ کعبہ کے اندر نماز پڑھوانے کا ثواب عمر کی قسمت میں لکھا تھا، بات اور کچھ بھی نہیں تھی، کوئی احسان نہیں عمر کا نبی پر، کوئی احسان نہیں، ہاں! امتِ رسول پر احسان ہے، لیکن احسان کرنے والے پر محمد کی جوتیوں کا احسان ہے، اگر حضور ﷺ ہی فرمادیتے کہ نہیں صحن کعبہ میں نہیں پڑھوں گا، جہاں میری مرضی ہوگی، یا جہاں میرا خدا کہے گا، وہاں پڑھوں گا، تو عمر کیا کر سکتے تھے؟ فرمایا: نہیں! تیری قوم نہیں پڑھنے دیتی، یہ بظاہر بے بسی ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے، لیکن کیا عمر ابن خطاب کوئی سارے ملک کے بادشاہ تھے؟ کیا وہ ملک الحجاز تھے؟ ایک مقتدر شخصیت تھی بنو

عدی کی، اور اس کا اثر تھا قبیلے کے علاوہ شہر کی زندگی پر، معاشرت میں وہ دخیل، سیاست میں اس کا اثر، نوجوانوں پر اس کا غلبہ، ہر چیز پر اس کا تسلط، تو ظاہری اسباب میں بات سمجھ میں نہیں آتی تھی، لیکن اصل بات یہی ہے کہ عمر ابن الخطاب کا نامۂ اعمال جو کھلا ہے، تو کھلتے ہی وہ نیکیاں درج ہونی شروع ہوئیں کہ ایک ولی کو اگر ایک کروڑ سال کی عمر دی جائے، تو وہ اتنی نیکیاں نہ کر سکے گا، جتنی عمر کو مسلمان ہونے کے ایک گھنٹے کے بعد نصیب ہوئیں، پانچ منٹ پہلے وہ شخص حضور کی خدمت میں جاتا ہے تو "کافر اعظم" ہے، اور واپس آتا ہے تو "موحد اعظم" ہے، اور جب مسجد کے صحن میں آئے تو کہا میں تلوار لے کر کھڑا ہوں، اور جس کی ہمت ہے وہ آئے اور نماز پڑھنے سے روکے، میں لوگوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اس شخص کو سچا پا لیا، میں نے بڑی دشمنی کی، میں نے بڑی زیادتیاں کیں، میں نے اس کو بہت تنگ کیا، لیکن اب میں نہیں بول سکتا، میرا دل، میرا دماغ، میرا سینہ بالکل کھل گیا کہ یہ شخص جھوٹا نہیں ہو سکتا، ہم جھوٹ بولتے تھے، یہ شخص جھوٹا نہیں، پھر آپ ﷺ نے نماز پڑھائی، عمر ابن خطاب نے تلوار لے کر پہرہ دیا اور نماز جاری ہوئی، ایسی نماز جاری ہوئی کہ اب قیامت تک نہیں رکے گی، عمر کی جاری کرائی ہوئی نماز ہے مکہ کے صحن میں سب بنو ہاشم موجود تھے، سارے بنو عبد الدار موجود تھے، بنو عقیل موجود تھے، بنو عبد المطلب موجود تھے، بنو اسد تھے، بنو مخزوم تھے، بنو امیہ تھے، سب موجود تھے۔ مگر یہ سعادت بنو عدی کے ایک فردِ فرید عمر ابن خطاب کے مقدر میں تھی کہ کعبے کے اندر نماز پڑھنے سے روکنے والا بھی وہی تھا، کعبے میں نماز جاری کرنے والا بھی وہی عمر ابن خطاب! یہ سب حضور ﷺ کی سیرت ہی تو ہے، اور کیا ہے؟ (تعمیر افکار سیرت نمبر: ص/۱۷۹ تا ۱۸۲)

سیرت کے موضوع کی ہمہ گیریت کو بیان کرتے ہوئے مرحوم ڈاکٹر محمود احمد غازی (جدت پسندی سے متأثر ہیں بلکہ مؤید و داعی گذرے ہیں البتہ مضمون سے ایسے مخدوش مواد کو حذف کیا گیا ہے پھر بھی اگر کوئی بات ہو تو نشاندہی کی گذارش ہے) فرماتے ہیں کہ:

علم سیرت ایک وسیع کینوس رکھتا ہے، اس وسیع کینوس کی وضاحت کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پورے اسلامی تمدن اور تاریخ کے مرحلۂ آغاز اور رسول اللہ ﷺ کے پورے پیغمبرانہ کیریئر کا ایک لینڈ اسکیپ۔

اس لینڈ اسکیپ میں وہ سب کچھ شامل ہے جس کا اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ سے کوئی تعلق ہو، اس میں مغازی کا تذکرہ بھی ہے، اس میں سیرت پاک کے دوران وقوع پانے والے اہم واقعات بھی ہیں، اس میں رسول اللہ ﷺ کا ذاتی طرز عمل اور سنتیں بھی ہیں، جن کو سننِ زوائد کے نام سے یاد کیا گیا، ان میں قبائل کا تذکرہ بھی ہے، جن سے رسول اللہ ﷺ کا تعلق رہا، قبیلہ قریش جو رسول اللہ ﷺ کا اپنا قبیلہ تھا، پھر اس کی شاخیں،

پھر شاخوں کی شاخیں، ان میں سے ہر قبیلے کے ساتھ حضور کا کوئی نہ کوئی تعلق رہا، یا حضور کا اپنا تعلق رہا، یا آپ ﷺ کے والد کا تعلق رہا، یا دادا کا، یا والدہ کا۔

ایک سیرت نگار نے لکھا ہے کہ عرب میں جتنے اہم اور بڑے بڑے قبائل تھے اور جو بھی قبیلے قبائل عرب کی تاریخ اور تمدن میں کوئی نہ کوئی مقام رکھتے تھے، ان سب میں رسول اللہ ﷺ کی بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی نہ کوئی رشتہ داری پائی جاتی تھی، سیرت اور صدر اسلام کی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ عربوں میں نسب ناموں کو بہت اہتمام سے محفوظ رکھا جاتا تھا، ہر عرب قبیلہ نہ صرف اپنا بلکہ اپنے غلاموں، اونٹوں اور گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد رکھتا تھا، اس دلچسپی کی وجہ سے علم انساب کے نام سے ایک علم وجود میں آیا، اس علم کی وجہ سے عرب قبائل کی آپس کی رشتہ داریوں کی تفصیلات محفوظ ہوگئیں، یہ اللہ تعالیٰ کی ایک حکمت تھی، ایک تکوینی مشیت تھی کہ بہت پہلے سے اس کا بندوبست ہو رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے آباء واجداد نے مختلف قبائل سے جو تعلقات قائم کئے ان کی تفصیلات جمع ہو کر محفوظ ہوتی رہیں، اب ان قبائل کی تفصیل، ان تعلقات کی نشاندہی، ان تعلقات کے اثرات، ان کا پس منظر، یہ سب خود علم سیرت کا ایک نیا میدان ہے، جس پر ابھی کام کا آغاز ہی ہوا ہے۔

پھر حضور اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کا تعلق عرب کے مختلف قبائل سے تھا، عرب کے جتنے بڑے بڑے قبائل تھے، مدینہ منورہ اور اس کے قرب وجوار میں، مکہ مکرمہ اور اس کے قرب وجوار میں، ان سب قبائل کے ساتھ رسول ﷺ نے ذاتی اور شخصی نوعیت کے تعلقات قائم فرمائے، ان تعلقات کا مقصد دعوتِ اسلام کے کام کو فروغ دینا اور دعوتِ اسلام کی مہم میں ان تعلقات کے اثرات کو استعمال کرنا تھا، سیرت نگاروں نے لکھا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ سے نکاح فرمایا تو اس کے بعد ابوسفیان نے اسلام کے خلاف کسی مہم کی قیادت نہیں کی، عرب کے معاشرہ میں کوئی شخص اپنے داماد کے خلاف فوج لے کر نہیں نکل سکتا تھا، عربوں کی قبائلی روایات اور معاشرتی اقدار اس کی اجازت نہیں دیتی تھیں کہ کوئی شخص اپنی ہی بیٹی کے سسرال کے خلاف تلوار لے کر نکل کھڑا ہو، یہ مقاصد تھے جو مختلف قبائل میں ازدواجی رشتے قائم کرنے میں رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر تھے۔

پھر رسول اللہ ﷺ کی اولاد مبارکہ، آل کی تفصیلات ہیں، یہ بھی سیرت کا ایک اہم باب ہیں، پھر حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے جس معاشرت اور معیشت کا قیام فرمایا، جو انتظامات اور ادارے قائم فرمائے، جو وثائق اور دستاویزات حضور ﷺ نے مرتب کرائیں، جن کا متن حضور علیہ السلام کے زمانے سے آج تک محفوظ چلا آ رہا ہے،

ان کو لکھنے والوں نے الگ الگ کتابوں میں مرتب کیا ہے، پھر حضور ﷺ کے خصائل، شمائل، خصائص اور فضائل وہ چیزیں ہیں جن پر سیرت کی ہر بڑی کتاب مشتمل ہے۔

لیکن یہ نہ سمجھئے گا کہ سیرت بس اسی کا نام ہے، علماء کرام اور محققین و مدونینِ سیرت نے یہ کوشش کی کہ ہر وہ چیز، جس کا حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی سے ذرہ برابر کا بھی تعلق ہے، بے شک کوئی براہِ راست تعلق نہ ہو، لیکن تھوڑا سا تعلق بھی ہو، تو اس کو بھی سیرت کے مطالعہ کے دائرہ میں لایا جائے، یہاں تک کہ وہ چیزیں جن کا کوئی اثر حضور کے پیغام کو سمجھنے پر نہیں پڑتا ان کو بھی مدون کرلیا گیا، اگر وہ معلومات نہ بھی ہوتیں تو بھی شاید علم سیرت کی وسعت اور اہمیت میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی، لیکن سیرت نگاروں کی ذاتی محبت، ذاتی عقیدت اور غیر معمولی احترام اور اہتمام نے وہ چیزیں بھی مرتب کرائیں، یہ غیر معمولی محبت اور احترام صحابہ کرام کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ ہر مسلمان اس بات کو جانتا ہے اور گناہ گار سے گناہ گار ترین مسلمان کو بھی اس بات کا اندازہ ہے کہ ذات رسالت مآب ﷺ کے لیے عقیدت واحترام اور عظمت کے کون سے جذبات واحساسات ہیں، جو مسلمانوں کے دلوں میں پنہاں ہوتے ہیں، اور انہوں نے کبھی اس غیر معمولی اور بے نظیر و بے مثل محبت وعقیدت کا احساس ہی نہیں کیا، جو مسلمانوں کے دلوں میں فروزاں رہتی ہے، بڑا گھسا پٹا سا مصرعہ ہے، جو کسی دوسرے سیاق وسباق میں کہا گیا تھا، لیکن مستشرقین پر ضرور صادق آتا ہے ؎

ہائے کم بخت تونے پی

ہی نہیں

ایک مستشرق نے پوری کتاب اس پر لکھ ڈالی کہ رسول اللہ ﷺ کا جو تصور قدیم سیرت نگاروں کے ذہنوں میں تھا، وہ تو محض ایک قبائل رہنما اور ایک مصلح کا تھا، لیکن بعد کی نسلوں نے محمد ﷺ کی ذات کو آئیڈیلائز کیا اور ان کی شخصیت پر عقیدت مندی کی ایک تہہ بٹھادی ، اس کی پوری کتاب کا مقصد ہی یہ سمجھانا ہے کہ Real Muhammad, Idolized Muhammad اور Idolized Muhammad میں بڑا فرق ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ مسلمانوں نے نہ کوئی چیز آئیڈیلائز کی نہ آئڈلایز کی۔ پھر اس نے اس فرضی عمل کے مختلف مراحل گنوانے کی کوشش کی ہے، یہ ساری غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ وہ عشقِ رسول ﷺ کے اس گہرے جذبہ کا ادراک ہی نہیں کرسکتا، جو ہر مسلمان کے دل میں کہیں نہ کہیں ضرور پوشیدہ ہے، یہ وہ چیز ہے جس کا کوئی اندازہ کسی غیر مسلم کو ہو ہی نہیں سکتا، جب تک کہ اس کو مسلمانوں کے جذبات واحساسات کا حقیقی ادراک اور علم نہ ہو۔

شروع شروع میں یعنی دوسری صدی ہجری کے وسط تک سیرت کے مختلف پہلوؤں پر چھوٹی چھوٹی کتابیں آئیں، جوں جوں یہ سارا مواد مرتب ہو ہو کر متداول ہوتا گیا اور لوگوں کے لیے دستیاب ہوتا گیا، ویسے

ویسے بعد میں آنے والوں کے لیے آسان ہوتا گیا کہ اس سارے مواد کو یکجا کرلیں، آٹھویں، دسویں صدی ہجری تک آتے آتے سیرت کی کتابیں دس دس، بارہ بارہ اور پندرہ پندرہ جلدوں میں لکھی جانے لگیں، یہ جو کتابیں بارہ جلدوں اور یا پندرہ جلدوں میں لکھی گئیں، ان میں سے بہت سی مطبوعہ طور پر دستیاب ہیں، ان کتابوں میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو سیرت نگاروں اور محدثین نے جمع کی ہیں، اور جن کا ان کے مصنف کی نظر میں حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق تھا۔

یہ تمام چیزیں جو ابھی میں نے بیان کیں وہ تو یقیناً سیرت کا لازمی حصہ ہیں، ان امور کے علاوہ مختلف قبائل کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے تعلقات کا مطالعہ بھی سیرت کا ایک ضروری اور اہم مضمون ہے، جن اصحاب کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا وہ بھی سیرت کا مضمون ہے۔ خدام، عمال اور کارندگانِ حکومت، قاضی، مفتی، یہ سب تو لازماً سیرت کا حصہ ہے ہی، لیکن یہ تفصیلات کہ حضور ﷺ نے کن کن سواریوں کو سواری کا شرف عطا فرمایا، آپ ﷺ کے استعمال میں گھوڑے کتنے تھے، اونٹنیاں کتنی تھیں، ان معلومات کو بھی سیرت نگاروں نے جمع کیا ہے۔ ان معلومات کی فراہمی میں دینی ذوق اور علمی دیانت کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی سے گہری محبت، یہ تینوں باتیں بیک وقت کارفرما ہیں۔

حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ سے صحابہ کرام کی محبت کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کرسکتا، حضرت ابوبکر صدیق پہلی مرتبہ سرکاری انتظام میں امیر حج کے طور پر زیارتِ بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، امیر حج بن کر آپ روانہ ہوچکے تھے اور کئی منزلیں طے کرچکے تھے کہ بعد میں سورۂ براۃ کی ابتدائی چالیس آیات نازل ہوئیں، جن میں کہا گیا ہے کہ جو معاہدے گزشتہ سال فتح مکہ کے بعد مشرکین کے ساتھ کئے گئے ہیں وہ چار مہینے کا نوٹس دے کر ختم کردیئے جائیں، اس کے لیے حضور ﷺ نے مناسب سمجھا کہ چونکہ تمام قبائل حج کے لیے مکہ مکرمہ پہنچ رہے ہیں ہوں گے، تو اگر حج کے موقع پر یہ اعلان کیا جائے تو زیادہ مفید رہے گا، اور سب کو معاہدات کی منسوخی کا علم ہوجائے گا، آپ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو سواری کے لیے اپنی اونٹنی دے دی، اور یہ آیات دے کر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے بھیجا۔

تمام سیرت نگاروں اور مؤرخین نے یہ بات لکھی ہے کہ سیدنا علی بن ابی طالب تیز رفتاری سے سفر کررہے تھے، تاکہ حضرت ابوبکر صدیق کے مکہ پہنچنے سے پہلے ان سے مل لیں، صحابہ کرام نے جب اونٹنی کی آواز سنی جو حضور ﷺ کی اونٹنی تھی، ''جدعاء'' اس اونٹنی کا نام تھا، کیوں کہ اس کے کان کٹے ہوئے تھے اور ''جدعاء'' کے معنی کٹے ہوئے کانوں والی اونٹنی کے ہیں، جب ''جدعاء'' کی آواز سنی تو صحابہ کرام تڑپ اٹھے، حضور ﷺ کی یاد آگئی، بہت سوں نے سمجھا کہ حضور ﷺ تشریف لے آئے ہیں، جس نے اتنی محبت سے اور ایسی نظر سے معاملات کو دیکھا ہو اور چیزیں جمع

کی ہوں، اس کے ذوق وشوق کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا، کہنے والے کہتے رہیں گے اور اپنا نامۂ اعمال مزید سیاہ کرتے رہیں گے کہ حضور ﷺ کی شخصیت پر عقیدت مندی اور شخصیت پرستی کی Layer اور سطح بڑھادی وغیرہ وغیرہ۔

رسول اللہ ﷺ کے جانوروں کے بارے میں معلومات موجود ہیں، اونٹنیوں کے بارے میں معلومات موجود ہیں، حضور ﷺ نے اگر کوئی بکری اپنے گھر میں رکھی تو اس کے بارے میں معلومات موجود ہیں، وہ بکری کس نے دی تھی، کس نے خریدی تھی، کس گھر میں تھی، کتنا دودھ دیا کرتی تھی۔ حضور ﷺ کے پاس اسلحہ کونسا تھا، آپ ﷺ نے جن گھروں اور حجروں میں رہائش اختیار فرمائی، ان کی پیائش اور دیگر تفصیل کیا تھی، اگر یہ سب کچھ نہ بھی معلوم ہوتا تو سیرت کے علم اور پیغام پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، لیکن ایک بے مثال جذبہ اور ایک بے پایاں ذوق وشوق تھا جس کے نتیجہ میں یہ معلومات جمع کی گئیں۔

چند سال پہلے پنجاب کے ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والے ایک صاحبِ علم نے، جو مدینہ منورہ میں مقیم ہیں، کئی سال کی محنت سے تین کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے ایک کتاب اس موضوع پر ہے کہ ازواجِ مطہرات کے حجرات کہاں کہاں واقع تھے، ان کا رقبہ کتنا تھا؟ کیسے بنے ہوئے تھے؟ پرانی کتابیں لے کر ایک ایک چیز کو ہاتھ سے ناپا، مثلاً اگر لکھا ہوا ہے کہ دس ہاتھ کا، تو دس ہاتھ سے ناپ کر نشاندہی کی ہے، اور "بیوت النبی" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے، یہ چیزیں آج تک چلی آرہی ہیں اور یہ سب سیرت مبارک کا حصہ ہیں۔

یہ ساری معلومات ایک اعتبار سے حدیث کا حصہ ہیں، اور ایک اعتبار سے سیرت کا حصہ ہیں، محدثین اور سیرت نگاروں دونوں حضرات نے ان معلومات سے اعتنا کیا ہے، لیکن محدثین کا اصل زور اور اہتمام رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، آپ ﷺ کے افعال واعمال اور تقریرات پر اس اعتبار سے ہے کہ کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز ہے، کونسی چیز سنت کا حصہ ہے اور کونسی چیز سنت کا حصہ نہیں ہے، اس کے برعکس سیرت نگاروں کا زور اس پر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ذاتی طرزِ عمل، شخصیتِ مبارکہ اور رویہ کیا تھا؟ اس لیے ان دونوں علوم کے مضامین ومباحث میں بڑا تداخل پایا جاتا ہے، بہت سے موضوعات ہیں جو حدیث کا حصہ بھی ہیں اور سیرت کا بھی، کچھ موضوعات ہیں جو صرف حدیث کا حصہ ہیں اور سیرت کا حصہ نہیں ہیں، کچھ موضوعات صرف سیرت کا حصہ ہیں اور حدیث کا حصہ نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ حدیث کی ہر بڑی کتاب سیرت کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات پر مشتمل ہے، حدیث کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں سیرت کے بارے میں بنیادی معلومات موجود نہ ہوں، اور وہ سارے بنیادی مسائل اور مباحث جن سے علم سیرت کا بڑا حصہ عبارت ہے وہاں دستیاب نہ ہوں، یوں علم سیرت کا اساسی ڈھانچہ علم حدیث کی بنیاد پر محدثین نے انتہائی چھان پھٹک کے بعد ایک ایک راوی کی تحقیق اور جرح کے بعد مرتب کر دیا۔

چناں چہ حدیث میں اصل بحث اقوال وافعالِ رسول ﷺ پر ہے، اور ذات وشمائلِ رسول ﷺ ضمناً زیر

بحث آتے ہیں۔ سیرت میں ذات وشمائلِ رسول اصلاً زیر بحث آتے ہیں، اور اقوال وافعال پر ضمناً اور تبعاً بحث ہوتی ہے۔ پھر جو چیز ذات رسالت مآب سے جتنی قریب ہے اتنی ہی وہ سیرت کے اصل اور صمیم میں شامل ہے۔ جو چیز جتنی قریب ہے وہ سیرت کے لُب (Core) میں شامل ہے، اور جتنی کوئی چیز ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے دور ہے اتنی ہی سیرت کے لُب سے بھی دور اور ہامشی ہے۔ (محاضراتِ سیرت ﷺ: ص/ ۲۲ تا ۲۷)

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

مطالعۂ سیرت کے اغراض ومقاصد

نبی کریم ﷺ کی ذات کوئی معمولی ذات نہیں کہ محض لطف اندوز ہونے کے لیے اس کا مطالعہ کیا جائے، اور نہ ہی تاریخی معلومات کے طور پر، اور نہ ہی کسی بڑے کی عظمت اور محض محبت میں ڈوب کر پڑھا جائے، یہ سب سطحی اغراض ہوسکتے ہیں، غیر مسلم تو اس انداز میں مطالعہ کرسکتا ہے، مگر مسلمان کے مطالعۂ سیرت کا مقصد ایک نہیں کئی ہوتے ہیں، مثلاً آپ ﷺ کے واقعات اس قابل ہیں کہ ان کو اسوہ بنایا جائے، اسی لیے تو آپ ﷺ کی اطاعت اور اتباع واجب ہے، کیوں کہ آپ اسلام کی گویا چلتی پھرتی عملی تصویر تھے، آپ ﷺ کی اطاعت کئے بغیر نہ اللہ کی صحیح معرفت حاصل ہوسکتی ہے اور نہ صحیح عبادت ہوسکتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت کو دیکھ کر ہر شخص اپنے شعبۂ زندگی کو صحیح ڈھنگ سے گزار سکتا ہے، داعیوں کے لیے دعوت کا اسلوب، مربیوں کے لیے تربیت کے اصول، حاکم اور بادشاہ، قیادت اور سیادت کو صحیح طریقے سے چلا سکتے ہیں، آپ کی سیرت کے اغراض میں سے زاہدوں کو زہد کا صحیح معنیٰ معلوم ہوتا ہے، تجار کو تجارت کا صحیح طریقۂ کار معلوم کرنا ہوتا ہے، مصائب اور آلام کے گرداب میں پھنسے ہوئے کو چھٹکارا حاصل ہوتا ہے، اور اللہ پر اعتماد وتوکل حاصل کرنا ہوتا ہے، علماء کو کتاب اللہ کو سمجھنے اور علم وعمل کا صحیح ڈھنگ سیکھنے کو ملتا ہے، امت کے ہر فرد کو آپ ﷺ کی سیرت کو پیش نظر رکھ کر اپنے اخلاق وکردار، آداب وشمائلِ حمیدہ کو اختیار کرنا یہی سیرت کے اغراض ومقاصد ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت کا اصل مقصد اور غرض لوگوں کو شرک وکفر کی تاریکیوں سے ہدایت کے نور کی طرف لانا ہے۔

سیرت کے مطالعہ کی ایک غرض ایمان کو تقویت پہنچانا بھی ہے، کیوں کہ جب معجزاتِ نبوی کو پڑھا جائے گا، تو ایمان قوی اور مضبوط ہوگا، سیرت کے مطالعہ کی غرض حضور سے والہانہ عشق اپنے اندر پیدا کرنا ہے، اور پھر

آپ کے لیے اخلاقِ فاضلہ اور معاملاتِ کریمہ اور لوگوں کی ہدایت کی فکر پیدا کرنا ہے۔

فلیح سالم مقاصد سیرت تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مطالعۂ سیرت اور کتابت کے اغراض و مقاصد تو بے حد و حساب ہیں، مگر چند اہم اغراض یہ ہیں: کلمہ شہادت کے جزء ثانی کا تحقق و اثبات، کلمہ شہادت: ''أشهد أن لا إله إلا الله، و أشهد أن محمدًا عبده و رسوله''۔ اور یہ دوسرا جزء: ''أشهد أن محمدًا عبده و رسوله'' اسلام کے اہم ترین اجزاء کی نشاندہی کرتا ہے۔ شہادتِ نبوتِ محمد چار امور کو مستلزم ہے:

۱- سیرت کا مقصد آپ ﷺ کی تصدیق شرح صدر کے ساتھ کرنا، ان تمام امور جو آپ ﷺ نے اللہ کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں بیان کی، اور متقین کو بطورِ بدلہ اور جزاء کے ملنے والی جنت کا جو تذکرہ کیا اور اس کی نعمہائے عجیبہ کی تصدیق کرنا، اور آپ ﷺ نے کافروں، مشرکوں اور گناہگاروں کے بارے میں جہنم اور اس کے جن عذابات کی تفصیل بیان کی ان کی تصدیق کرنا، غرضیکہ غیب کی جتنی بھی خبریں آپ نے بیان کی بلا چوں و چراں ان پر ایمان لانا۔

۲- سیرت کے مطالعہ کا دوسرا مقصد آپ کی ہر ہر امر میں مکمل اطاعت، چاہے عقائد سے متعلق ہو یا سیاست سے متعلق، معیشت سے متعلق ہو یا معاشرت کے متعلق، افکار سے متعلق ہو یا تہذیب کے متعلق، انفرادیت کے متعلق ہو یا اجماعیت کے متعلق، آپ کی مکمل اطاعت کرنا۔

۳- آپ ﷺ نے جن چیزوں سے روکا اُن سے باز رہنا، مثلاً شرک، کفر اور معصیت وغیرہ۔

۴- اللہ کی عبادت محض اسی طریقہ کے مطابق کرنا جو طریقہ آپ ﷺ نے بتلایا ہو۔

(السیرۃ النبویۃ اہمیتہا اقسامہا مقاصد دراستہا، لمحمد بن صامل السلمی: ص/ ۴۲ تا ۴۴)

نیز دکتور مہدی رزق اللہ احمد تحریر فرماتے ہیں:

ﷺ سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآنی آیات اور احادیث نبویہ میں موجود احکام کو زندگی کے مختلف شعبوں میں عملی طور کس طرح نافذ کیا؟

ﷺ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا و اتباع کا اولین تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں میں آپ کی صفات و اخلاق، آپ کی نبوت کے دلائل اور خصائص کی معرفت حاصل کی جائے، جو شخص آپ کے اخلاق و اوصاف سے آگہی حاصل کرے گا وہ یقینا آپ سے محبت بھی کرے گا، اور آپ کی پیروی بھی کرے

گا، یوں وہ اللہ تعالیٰ سے اجرِ عظیم پائے گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{لقد كان لكم في رسول الله أسوةٌ حسنةٌ لِّمن كان يرجوا اللهَ واليومَ الاٰخرَ وذكَر الله كثيرًا}

''یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول (کی ذات) میں بہترین نمونہ ہے، ہر اُس کے لیے جو اللہ (سے ملاقات) اور روزِ آخر کی امید رکھتا اور اللہ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرتا ہے۔'' (الاحزاب: ۳۳:۲۱)

- رسول اللہ ﷺ کی پیروی اس بات کی دلیل ہے کہ بندہ اپنے ربِ عظیم سے محبت رکھتا ہے اور وہ جلد ہی اللہ تعالیٰ کا محبوب ہونے کا اعزاز حاصل کرلے گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله}۔

''آپ کہہ دیجئے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

(آل عمران: ۳:۳۱)

- سیرت نبوی رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کے جذبۂ ایمان ویقین کے ان واقعات سے بھری ہوئی ہے، جو ان سے اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر ظہور پذیر ہوئے، ان دل آویز واقعات کی معرفت سے مومنین کے عزائم کو قوت ومضبوطی حاصل ہوتی ہے، دینِ حق کے دفاع کا جذبہ مستحکم ہوتا ہے اور دلوں کو سکون واطمینان نصیب ہوتا ہے۔
- آں حضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں وعظ ونصیحت اور عبرت وحکمت کے بے مثال نمونے جلوہ گر ہیں، جن سے ہر صاحبِ شعور مستفید ہوسکتا ہے، چاہے وہ حاکم ہو یا محکوم، اسے معلوم ہوجائے گا کہ جو شخص ظلم اور تکبر کرتا ہے وہ کس عبرتناک انجام سے دوچار ہوتا ہے۔
- آں حضرت ﷺ کی سیرت میں ہر شعبۂ زندگی کے لوگوں کے لیے سبق پوشیدہ ہے، خصوصاً دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے عظیم الشان رہبری ہے، جس سے دعوت الی اللہ کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات اور آزمائشوں سے نمٹنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے۔
- رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ ایک انسانِ کامل کے لیے ہر اعتبار سے اعلیٰ درجے کی نادر مثال ہے۔
- رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ پڑھنے سے کتاب اللہ اور سنت رسول کے فہم میں بڑی مدد ملتی ہے۔
- سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرنے والے کو عقیدہ وایمان، شریعت، اخلاق، تفسیر، حدیث، صداقت، سیاست، عدالت، دعوت وتربیت اور معاشرت اور دیگر اُمور کے بارے میں بالکل صحیح، مستند اور مفید معلومات

حاصل ہوتی ہیں۔

ﷺ سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے دعوتِ اسلامیہ کے تدریجی حالات اور نشیب و فراز کے مراحل و مسائل سے آگاہی اور ان کٹھن مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے، جن سے نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرام کو اعلائے کلمۃ اللہ کے سلسلے میں گزرنا پڑا، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ آپ نے پیش آمدہ دشواریوں کی گھاٹیاں عبور کرنے کے لیے کیا طریق کار اختیار کیا۔

ﷺ قرآنی آیات کے اسبابِ نزول اور رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کے بہت سے ارشادات وفرامین سے صحیح معنوں میں باخبر ہونے کے لیے سیرتِ طیبہ کا مطالعہ شرطِ لازم ہے۔

ﷺ قرآن کریم اور سنتِ مطہرہ میں ناسخ ومنسوخ کی صحیح معرفت سیرتِ طیبہ ﷺ کے واقعات کی روشنی میں حاصل ہوسکتی ہے۔

ﷺ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے صادر ہونے والے معجزات کا صحیح فہم وہ واقعات جانے بغیر نصیب نہیں ہوسکتا، جن کے پس منظر میں یہ معجزات صادر ہوئے، اور ظاہر ہے کہ معجزات کی معرفت مسلمان کے ایمان ویقین میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

ﷺ نبی کریم ﷺ کے خصائص وامتیازات کی صحیح معرفت آپ کی سیرتِ طیبہ کی روشنی میں ہوسکتی ہے۔

ﷺ سیرتِ طیبہ ﷺ کا تحقیقی مطالعہ کرنے سے ان صحیح احادیث کی معرفت حاصل ہوتی ہے، جن سے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر استدلال کیا جاسکتا ہے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سیرتِ طیبہ کے مطالعے میں ان احادیث کو کتنی زبردست اہمیت حاصل ہے۔

(سیرتِ نبوی ﷺ: ۱/ ۳۰ تا ۳۲، دکتور مہدی رزق اللہ احمد، مکتبہ دار السلام، الریاض)

سیرت کے مقاصد میں یہ بھی ہے کہ سیرت عملی طور پر اللہ کی مرضیات کا سرچشمہ ہے، لہٰذا سیرت کو پڑھ کر ہم اللہ کی مرضیات کی صحیح راہ معلوم کرسکتے ہیں۔

مطالعہ سیرت کے مقاصد میں سے ازدیادِ عشقِ رسول بھی ہے، قرآن کا علان ہے: {قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ} [آل عمران: ۳۱] سیرت کے مقاصد میں یہ بھی ہے کہ سیرت کے مطالعہ سے ہم درس وعبرت حاصل کریں کہ آپ ﷺ سے محبت کرنے والوں کو بہترین بدلہ ملا، اور آپ کے ساتھ عدوات کرنے والوں کا کیسا برا انجام ہوا، آپ ﷺ نے خوشی کا اظہار کس حدود وقیود کے ساتھ کیا، اور آپ نے غم والم کو کیسے

برداشت کیا، آپ نے کیسے صبر کیا اور کیسے شکر کیا، سیرت کے مدعا پر ابومعاویہ ابوذر فرماتے ہیں:

سیرتِ رسول ﷺ سے مقصود کیا ہے؟ وہ غرض کیا ہے، وہ کون سی بات ہے جس کے لیے سیرت بیان کرنے کی ضرورت ہے؟ وہ کون سا مرض ہے جس کا علاج سیرت کے بیان میں موجود ہے؟ اصل بات یہاں سے شروع ہوتی ہے، سیرت تو ساری عمر بیان کرتے رہیے، صرف حضور ﷺ کے سراپائے مبارک کو بیان کرنا شروع کرے ایک آدمی کے سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخن تک، اسی میں لگا رہے ساری عمر تو ختم نہیں ہوتی۔ حسان ابن ثابت اور حضرت شیخ بوصیری کے قصیدہ بردہ سے لے کر محسن کاکوروی ظفر علی خاں کی نعتوں تک، اور موجودہ دور کے نیم کمیونسٹ حتیٰ کہ کمیونسٹوں کی لکھی ہوئی نعتوں کو بھی پڑھ لو تو نعت تو ختم ہی نہیں ہوتی۔

ہندوؤں نے نعتیں لکھی ہیں، دتو رام کوثری کی نعتیں پڑھ لو، پنڈت ہری چند اختر ہی کی نعتیں پڑھ لو، مسلمانوں نے نہیں لکھیں، کیسی نعتیں جیسی پنڈت دلورام نے لکھی ہیں، اصل میں تو اس کے متعلق مشہور ہے، علماء بھی فرماتے ہیں اور پنجاب کے باخبر لوگ بھی کہ وہ اندر سے مسلمان تھا، قوم کے ڈر کے مارے اس نے اپنا نام دلورام ہی رکھا اور پنڈت ہری چند اختر اباجی (سید عطاء اللہ شاہ بخاری) کے ملنے والوں میں، حفیظ جالندھری، احمد شاہ پطرس، ڈاکٹر محمد دین تاثیر ان سب کا وہ ہم نشین تھا، وہ عملی طور پر آدھا مسلمان ہی تھا۔

حضرت عباس ابن عبد المطلب حضور کی دادی سے سوتیلے چچا ہیں، بہت خوب صورت، بڑے حسین وجمیل، بڑے قدآور، بلند آواز اتنے کہ یہاں کھڑے ہو کر آواز دیں تو پون میل تک آواز جاتی تھی، غزوہ حنین میں انہی نے حضور ﷺ کے پاس کھڑے ہو کر آواز دی تھی، تو تمام صحابہ کا لشکر لوٹ آیا تھا، حضرت عباس ابن عبد المطلب غزوۂ بدر میں قید ہوتے ہیں، ستر، بہتر دوسرے قیدیوں کے ساتھ کچھ صحابہ شہید ہوتے ہیں، جب حضور نے فدیہ لے کر حضرت عباس کو واپس کیا تو پتہ نہیں کان میں کیا کہا؟ دل سے کیا دعا کی کہ وہ اندر سے مسلمان ہو گئے، ہدایت فرمائی کہ اب تم مکہ میں رہنا، ابھی آنا مت، ورنہ تم کو کفار مار ڈالیں گے، اب وہیں رہنا، جب خدا نہ کہے اور میں تم کو نہ کہوں مکہ سے نہ ہلنا، تو حدیث کی گواہی یہ ہے: "**قد أخفى إسلامه**" کہ حضرت عباس ابن عبد المطلب اندر سے مسلمان تھے اور انہوں نے اپنا اسلام مخفی رکھا۔

اسی طرح حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کا بھی یہی حال تھا، علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ "**أسلم معاوية قبل الفتح و كتم إسلامه**" کہ معاویہ بن ابی سفیان فتح مکہ سے بہت عرصے پہلے مسلمان ہو چکے تھے، لیکن ماں باپ اور رشتہ دار کافر، سارا شہر کافروں سے بھرا ہوا، ان کے ڈر کی وجہ

سے بے چارے بول نہیں سکتے تھے، حالاں کہ چوتھی سوتیلی بہن ام المؤمنین ام حبیبہ رملہ بنت ابی سفیان، وہ سابقون الاولون میں شامل ہیں، حضور ﷺ کے پھوپی کے لڑکے عبید اللہ بن جحش کی بیوی ہیں، دونوں اول المہاجرین میں شامل ہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ عبید اللہ بن جحش بد قسمتی سے وہاں جا کر عیسائیوں کی صحبت میں بیٹھے اور مرتد ہو کر مر گئے، اور ام حبیبہ وہاں بیوہ ہوگئیں، اللہ کی مرضی سے صحابہ کرام کو القا ہوا، صحابہ نے حضور ﷺ سے عرض کیا، حضور نے سفارش قبول فرمائی اور ام حبیبہ کو حبشہ میں نکاح کا پیغام بھیجا، انہوں نے خواب دیکھا، خواب کی تعبیر میں انہوں نے اس کو قبول فرمایا، حضرت علی کے بڑے بھائی جعفر طیار نے خطبۂ نکاح پڑھا، نجاشی گورنر حبشہ نے حضور ﷺ کی طرف سے، سب سے زیادہ گراں مہر چار سو دینار (ایک سو چار تولہ ایک ماشہ) سونے کا مہر حضور ﷺ کی طرف سے ادا کیا، ابویعلیٰ اور ابوامیہ ضمری اور شرحبیل ابن حسنہ یہ ام حبیبہ کی ڈولی اٹھا کر مدینہ آئے، یہ ہیں ام حبیبہ، بہن اتنی زبردست مسلمان، باپ کافر، سوتیلی ماں ہند کافر، یزید بن ابی سفیان سوتیلے بھائی وہ کافر، بے چارے ڈرتے رہے، اور کھلے کس دن؟ جب حضور ﷺ فتح مکہ کے دن مکہ میں داخل ہوئے، جب داخل ہوتے ہیں، مکہ میں تو ابوسفیان تو فجر کی نماز کے وقت انہی عباس ابن عبدالمطلب کو سفارشی بنا کر ساتھ لائے، عمر ابن خطاب تلوار مارنے لگے، بچ گئے، حضور ﷺ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا، کہنے لگے، کون ہے؟ کہا کہ ابوسفیان ہے، پوچھا کہ کیوں آیا؟ بتایا گیا کلمہ پڑھنے کے لیے، حضور ﷺ خاموش ہو گئے، ساری دشمنیاں، سارا بغض وعداوت یاد آ گیا کہ وہ شخص جو میرے خون کا پیاسا ہے، جو میرا رشتے میں بھائی ہے، میرے دوسرے دادا کی اولاد ہے، جس کی لڑکی میرے پھوپھی زاد بھائی کی بیوی ہے، وہ آج میرے سامنے ہے، حضور ﷺ چپ ہو گئے، اب صحابہ تلملا رہے ہیں کہ حضور حکم دیں ہم گردن اتاریں، حضور بولتے نہیں، کیسے بولیں؟ اللہ نہیں بولنے دیتا، اگر ابوسفیان کی قسمت میں کفر کی موت ہوتی، نبی فوراً بولتے کہ "اس کو پکڑ لو اور مار دو اس کی گردن" حضور ﷺ چپ ہیں، ہاتھ بڑھایا! ہاتھ میں ہاتھ دیا، توجہ کرائی، ابوسفیان کی قسمت جاگ اٹھی، دوزخ سے نکل کر جنت میں آ گیا، وہاں سے نکلے مکہ والوں کو بتا دیا کہ میں مسلمان ہو گیا، معاویہ اندر سے مسلمان تھے، وہ حضور ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی یا رسول اللہ میں پہلے ہی مسلمان ہوں، بڑے بھائی ساتھ تھے، یزید بن ابی سفیان، جب مکہ فتح ہو گیا، کلمہ پڑھا دیا، جنہوں نے توبہ کرنی تھی، توبہ کر گئے، جنہوں نے معافی مانگنی تھی مانگ گئے، واپس ہوئے۔ (تعمیر افکار، سیرت نمبر: ص/ ۱۸۲ تا ۱۸۴)

غرضیکہ یہ اوراس جیسے بے شمار اور مقاصد، سیرت میں شمار کیے جا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان مقاصد کو مد نظر رکھ کر مطالعۂ سیرت کی توفیق عطا فرمائیں۔آمین یارب العالمین!

☆......☆......☆

عظمت سیرتِ نبوی ﷺ

سیرت کی تعریف، موضوع اور غرض وغایت اور مقصد کے بعد آیئے! اب عظمت سیرت نبوی پر روشنی ڈالتے ہیں تاکہ سیرت کے مطالعہ سے قبل عظمتِ سیرت دل میں بیٹھ جائے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ تحریر فرماتے ہیں:

''جدید تعلیم یافتہ طبقے کا تصور اس نوعیت (یعنی سیرت) کے بارے میں دھندلا ہے۔'' (تعمیر افکار، سیرت نمبر: ص/۱۱)

لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ فن سیرت نگاری کے بارے میں جدید نہج پر عرض کروں۔

ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

سیرت کو محض سوانح عمری (بائیوگرافی) سمجھنا غلط ہے، یہ ایک ارفع واشرف تشکیلی عمل ہے، جدید تصور کی بائیوگرافی ہرگز نہیں، اسی مغالطے کی وجہ سے آں حضرت ﷺ کے بہت سے جدید سوانح نگاروں نے ٹھوکر کھائی ہے، اسے اگر بائیوگرافی کہنا ہی ہو تو برتر (Super) بائیوگرافی کہا جا سکتا ہے، تاہم اس کے یہ معنی نہیں کہ سیرت بائیوگرافی کے خصائص سے خالی ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ سیرت بائیوگرافی تو ہے، لیکن اس مخصوص اور ارفع قسم کی بائیوگرافی ہے۔

آں حضرت ﷺ کے بعض مغربی سوانح نگاروں نے اسے (Hagiography) یعنی سیرۃ الاولیاء کہہ کر اس کا مرتبہ گھٹانے کی کوشش کی ہے، لیکن سیرت Hagiography ہرگز نہیں۔جیمز ایل کلفر ڈ J.L.Clefferd کے نزدیک Hogiography کے معنی ہیں مقدسین کے سوانح، جن کے بارے میں یہ اصرار کیا جاتا ہے کہ انہیں عام انسانوں سے اونچا رکھ کر محیر العقول واقعات اور افسانوں پر مشتمل سوانح عمریاں

مرتب کی جائیں (دیکھئے اس منصف کی کتاب Biography)، لیکن آنحضرت ﷺ کی با اصول سیرت میں مدح طرازی، مبالغہ آرائی اور خیال بافی کا شائبہ تک نہیں، سیرت کا اصل جوہر وہ اسوۂ حسنہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ہر قول و فعل کی صحیح ترین روایت پر مبنی ہے، دنیا میں سچی سے سچی بائیوگرافی دیکھنی ہو تو اسے سیرت رسول اللہ ﷺ کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے، جو قرآن و حدیث پر مبنی لکھی گئی ہیں، اور جن میں واقعات کی چھان بین قرآن کی روشنی میں اور حدیث کے طریقۂ درایت سے ہوئی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ سیرت کے بارے میں قدیم اور جدید دونوں زمانوں میں کچھ غلط فہمیاں بھی موجود ہیں، قدیم زمانے میں اس کا باعث اس لفظ کے مفاہیم کی کثرت تھی، اس کثرت کے اندر سے کسی ایک جزوی معنی کو سامنے رکھ کر، اس کے مطابق سیرت نگاری ہوتی رہی، قدیم زمانے میں بعض سیرت نگاروں نے ایک مخصوص مفہوم کو مدِ نظر رکھ کر، آنحضرت ﷺ کے بعض خاص جزوی احوال پر زور دیا، آپ ﷺ کے احوال کا صرف ایک حصہ یا کچھ حصہ سامنے آیا، مثلاً چونکہ سیرت کے ایک معنی جنگوں کا بیان بھی ہے، اس لیے اولین کتبِ سیرت کو سیرت بھی کہا گیا، مگر شہرت لفظ مغازی کی زیادہ ہوگئی، مثلاً ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہا جاتا ہے اور سیرت بھی، لیکن مغازی کی اصطلاح کو غلبہ حاصل ہوگیا، اسی طرح مغازی واقدی وغیرہ وغیرہ۔ ابن ھشام نے سیرت کے لفظ کو اصطلاحی طور پر عام کیا، واقعہ یہ ہے کہ سیرت کے یہی ایک معنی جنگوں کا بیان ہی نہیں، کئی اور معنی بھی ہیں، مثلاً طریقہ و مذہب، سنت، ہیئت، حالت، کردار، داخلی شخصیت، کہانی، اہم کارنامے اور اکابر کے حالات زندگی، غیر مسلموں کے ساتھ آں حضرت ﷺ کا معاملات جنگ و صلح کا طریقہ وغیرہ کئی معنی شامل ہیں، لیکن مصنفین کی جزویت پسندی نے خلطِ مبحث کر دیا، اس طریقِ کار کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیرت کا لفظ آں حضرت ﷺ کی بائیوگرافی کے ساتھ مخصوص نہ رہا، محض قصہ نگاری اور داستان گوئی کو بھی، یعنی کسی افسانوی یا حقیقی ہیرو کی داستانِ شجاعت کو بھی سیرت کہہ دیا گیا ہے، مثلاً ''سیرت عنتر'' اور ''سیرت سیف بن ذی یزن''، یہ مفہوم دراصل اس معنی سے پیدا ہوا جس کا تعلق جنگوں سے تھا، ہمارے ادیبوں کے جدید دور میں عام اشخاص کی بائیوگرافی کو بھی اس قسم کی جزوی وجہ سے سیرت کہا جانے لگا ہے، اور یہ بھی میرے خیال میں زیادتی ہے، وجہ کچھ بھی ہو، اور اس کے جزوی مفہوم کچھ بھی ہوں، سیرت کے لفظ کو اصولی طور پر آں حضرت ﷺ کے حالات ہی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔

مجھے یہ بھی ثابت کرنا ہے کہ سیرت یعنی برتر بائیوگرافی میں برتری کے عنصر کے باوجود ایک باضابطہ اور سائنٹیفک بائیوگرافی کے جملہ ضروری خصائص پائے جاتے ہیں، اگرچہ آج کل جس چیز کو خالص سائنٹیفک

بائیوگرافی کہا جاتا ہے یعنی جس میں تحلیل نفسی اور Behaviourism یعنی ظاہری قول وفعل کی بنا پر باطن کے محرکات کا سراغ لگایا جاتا ہے، اور جسے خود جدید تنقید ظنی وتخمینی عمل قرار دیتی ہے، جیسا کہ جدید سوانحی نقاد Leom Edel نے لکھا ہے:

In a strange asivr and aften and often subterranean way, the teaching of psychoanalysis have filtered into biography and criticism and often in distorted from. distorted because psycho-analysis itself has had to define and redefine its concepts: and because. as is usually the case. a cartain amount of dilution, vulgarization and adulteration is literary scholars so far have not had a sufficient grasp of psycho-analytical ideas to apply them with accuracy. On their side, the psycho-analysis are for the the most part rank amateurs when they come to the discussion of Literature,

And yet students Of Literature, hitherto addicted to a hunt for 'sources' of the Literary work, in seeking to uderstand the imaginative process today indulge in another 'pursuit-an exuberant chase after symbol and myth, the 'inner' meaning of a work, the 'deeper' Levels of imagination .

بائیوگرافی میں تحلیل تفسی کا استعمال بے جا ہے، کیوں کہ یہ علم ابھی خود بھی ظنی ہے، تو سیرت میں ان عنصر کی تلاش یا اس پر اصرار سخت بے محل اور بے جا ہے۔

فن سوانح نگاری کے جدید نقادوں میں ایڈ مند گوس، لٹن سٹریچی، اندرے مورو، ہیرلڈ نکلسن وغیرہ شہرت رکھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک نے ایک اچھی بائیوگرافی کے لیے خلوص اور صداقت کو بنیادی اہمیت دی ہے، بائیوگرافی کی ہیئت اور اس کے مقصد کے باب میں ہر ایک کے خیالات اپنے ہیں، لیکن واقعے کی صداقت پر یکساں زور دیتے ہیں، اور صداقت کی جستجو کے لیے ہر ممکن ذریعے کو استعمال کرنے کے حق میں ہیں، تو گویا اصل

شے واقعہ کی صداقت ہوئی، پس اگر یہ اصول درست ہے، تو فن سیرت میں حدیث کی روایت اور اس پر عقلی وتجربی درایت سے بہتر کون سا طریقہ اور واقعہ صحت کو پرکھنے کا ہو سکتا ہے۔

جدید سوانحی نقاد بائیوگرافی میں مکمل انسان اور اس کی ہو بہو تصویر کشی پر بھی بہت زور دیتے ہیں، لیکن ہمیں کہنا پڑیگا کہ سیرت سے زیادہ مکملیت کسی بائیوگرافی میں نہیں ہو سکتی، البتہ سیرت اس ہو بہو تصویر کشی میں اعتقاد نہیں رکھتی، جو مغربی سوانح نگاروں کے مد نظر ہے، جدید سوانح نگاروں کی ہو بہو تصویر کشی میں بڑی حد تک تخیل سے کام لیا جاتا ہے، یہ نقاد تصویر کشی پر اس لیے زور دیتے ہیں کہ ان میں سے اکثر سوانح عمری کو ایک ادبی قصہ یا ناول بنانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ہمیں یہ اعلان کرنے میں باک نہیں کہ سیرت کو ناول جیسا ادبی قصہ بننے کا دعویٰ ہے نہ مصوری کا، یہ تو رسولِ خدا ﷺ کے ہر قول و فعل کو صحیح صحیح فراہم کر کے اسے تاریخ و سنین کے سیاق وسباق میں جمع کرنے کا نام ہے، تاکہ اس سے وہ اسوۂ حسنہ برآمد ہو سکے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، لہٰذا سیرت میں تخیل آرائی اور تصویر بافی سخت جرم ہے، باقی رہا مکمل ہونا سو یہ اس لیے مسلم ہے کہ آنحضرت ﷺ کے حالات جمع کرنے میں لاکھوں مخلص اور نیک لوگوں نے جس طرح کوشش، کاوش اور محنت کی، جسے مغربی مصنفین بھی تسلیم کرتے ہیں، اس سے بڑھ کر مکمل کیا چیز ہو سکتی ہے۔

مغربی مصنفوں نے سوانح عمری کے بارے میں بشریت کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے، یعنی بہ حیثیت بشر سوانح عمری کے موضوع کی کمزوریوں کا بیان بھی لازم ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں آنحضرت ﷺ کے مغربی سوانح نگاروں میں سے بعض نے تعصب سے اور بعض نے آنحضرت ﷺ کو ایک عام بشر سمجھ کر ان کی طرف نامناسب باتیں منسوب کی ہیں۔

ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں اور اس پر ہمیں شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، میں کہہ چکا کہ بائیوگرافی کا یہ وصف کہ اس میں صداقت سے سرمو تجاوز نہ ہو، سیرت میں موجود ہے، اگرچہ سیرت جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے برتر بائیوگرافی ہے کہ اس کے بعض اصول عام بائیوگرافیوں سے برتر اور الگ بھی ہیں، بہر حال سیرت میں جامعیت بھی ہے اور خلوص بھی، لیکن اس کے واقعات ایک برتر انسان کے موزوں نہیں، جن کا جدید نقاد تقاضا کرتے ہیں۔ اسرارِ نبوت کی تفسیر وتعبیر یا تو قرآن مجید کے ذریعہ ہوگی، یا خود آنحضرت ﷺ کی حدیث سے، اس کے لیے ظنی، نفسیاتی اور تحلیلی طریقے درست نہیں ہو سکتے، سیرت برتر بائیوگرافی ہے، لہٰذا اس میں واقعات کے محرکات بھی برتر انسانیت کے پیمانے سے ناپے جانے چاہئیں۔ (مستفاد از تعمیر افکار، سیرت نمبر: ص/ ۱۲ تا ۱۴)

معلوم ہوا کہ سیرت اپنے اندر بڑی عظمت کی حامل ہے، حضرت آدم علی نبینا علیہ الصلوۃ والسلام سے لے کر آج تک کسی کی سیرت وسوانح کو اتنی محبت وعظمت اور باریکی کے ساتھ نہیں جمع کیا گیا، جتنا آپ ﷺ کی سیرت کو کیا گیا، کیوں کہ آپ ﷺ کی سیرت کوئی ایک انسان کے سوانح کی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ ایک سچے اور برحق دین کی عملی صورت ہی کی حامل ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ انسانی زندگی کے لیے دستورِ حیات ہے، قرآن کریم پر مکمل عمل کر کے بتلایا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی تھیں: "خُلُقُهُ الْقُرْآن" آپ ﷺ قرآن کی چلتی پھرتی مثال تھے۔

عظمت سیرت پر انتہائی ولولہ انگیز خطاب کرتے ہوئے مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

ہر وہ شخص جس کی سیرت پر نگاہ ہے، جس کو کتاب وسنت کے ساتھ کچھ ربط وتعلق ہے، وہ سمجھتا ہے کہ دیکھنے میں جتنا اس موضوع کو عام کیا گیا ہے اتنا ہی یہ موضوع اہم ہے، لیکن ہر چیز کا ایک تو کثرت استعمال اور پھر غلط طریقۂ استعمال اس کی عظمت کو کھو دیتا ہے، سیرت کی اپنی ذاتی عظمت کو تو دنیا کی کوئی طاقت نہیں ہلاسکتی، اس لیے کہ صاحب سیرت ﷺ کے دم قدم سے دنیا کی عزت وعظمت قائم ہے، لیکن سیرت کے موضوع کو غلط طریقے پر استعمال کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب لوگ سیرت بھی سننا پسند نہیں کرتے، وہ دنیا داروں کی کہانیاں سن لیں گے، اپنے پیر کی تعریف میں دس قصائد سن لیں گے، لیکن سیرت النبی کا جو حق ہے اس کو وہ سننے کے لیے تیار نہیں، وجہ اس کی اور کچھ نہیں کہ ہمارے واعظین ومبلغین نے طریقہ ایسا اختیار کیا ہے کہ سیرت کی عظمت کو وہ قائم نہیں رکھ سکے، اگر علمائے حق میں سے، اکابرینِ امت میں سے ایسے لوگ نہ ہوتے جو سیرت کو صحیح معنی میں بیان کرتے، اور بیان کرنے سے پہلے سیرت کے متعلق اپنے وجود کو سیرت کے ساتھ مطابقت نہ دیتے، یعنی سیرت کے حال میں خود نہ ڈھل جاتے، صاحب سیرت کے انوار اور آپ کی برکات کو اپنے وجود میں نہ سمو لیتے، تو آج سیرت نہ کوئی سنتا نہ کوئی بیان کرتا، جب نمونہ بیان کرنے والا ہی کوئی نہ ہوگا، تو پھر نمونے کی کیفیت کون بیان کرے گا؟ حدیث شریف کی کتابوں میں عام روایات آتی ہیں، اور میرے دل کی تسلی ہوتی ہے کیوں کہ کمزور ایمان کا آدمی ہوں، بعض باتوں میں وہم ہو جایا کرتا تھا، بعض حضرات سے سنا تو میں کہتا کیا یہ اسی زمانے میں مبالغہ شروع ہوا ہے؟ حضور ﷺ کی تعریف میں یا فی الواقع حضور کی عظمت وعزت ایسی ہی تھی؟ آپ کی کرامت اور برکت ایسی ہی تھی کہ دورِ اول میں بھی مسلمانوں کا یہ حال رہا؟ لیکن صحابۂ کرام کے حالات پر تھوڑی سی نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ ہمیں تو ابھی

وہ جستجو ہی نہیں، ہم میں وہ کیفیت ہی نہیں، اس لیے کہ ہمیں تیرہ سو برس کا عرصہ گزر گیا، جن لوگوں کی آنکھوں کے سامنے وہ جلوہ تھا اور گم ہوا، پوچھو ان سے تم پر کیا قیامت گزر گئی؟

صحابہ کی وارفتگی:

ہم نے تیرہ سو برس کے بعد اپنے علماء سے اپنے واعظوں سے سنا تو ہمارا یہ حال ہے، کچھ ان کے دل سے جا کے پوچھو جن کے سامنے سے یہ نعمت گم ہوئی، جو مسجد میں چوبیس گھنٹے آپ ﷺ کو دیکھتے تھے، آپ کے حلقے میں بیٹھتے تھے، آپ کی زیارت سے دل و دماغ کو ٹھنڈا کرتے تھے، آنکھوں کو منور کرتے تھے، ایمان کو تازگی بخشتے تھے، ان کا کیا ہوا ہوگا؟ جب حضور ﷺ وصال فرما کر زمین کے اندر تشریف لے گئے ہوں گے؟ اور وہ بات غلط نہیں ہے کہ اس وقت حضرت صدیق اکبر کو چھوڑ کر صحابۂ کرام کی اکثریت دم بخود تھی، یہ حدیث کی روایت ہے، فاروق اعظمؓ جیسا باہوش اور فرزانہ، وہ انسان کہ جس کے نام کے ساتھ فرزانگی اور عقل وابستہ ہے، اس کی حالت یہ تھی کہ وہ دیوانوں کی طرح مسجد نبوی میں تلوار لیے پھرتا تھا کہ "اگر کسی نے حضور ﷺ کے متعلق یہ کہا کہ آپ دنیا سے چلے گئے ہیں، تو میں اس کا سر اتار دوں گا"۔

علماء نے اس پر بڑی بحثیں کی ہیں، بخاری کی ایک روایت پر بڑی بحث ہوئی ہے، کیا موت کے متعلق عمر بن الخطاب کو شک تھا کہ موت نہیں آسکتی؟ یا یہ شک تھا کہ اس وقت حضور کو وہ موت نہیں آئی، ابو بکر تو فرما رہے ہیں: "**مَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّهُ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ**" کہ جو خدا کو پوجتا تھا وہ سن لے کہ خدا زندہ ہے۔ "**وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّهُ قَدْ مَاتَ**" اور اگر محمد کریم کی پوجا کر کے خود کو مسلمان سمجھتا تھا تو پھر وہ یقین کرے کہ اس کا خدا تو آج دنیا سے رخصت ہو گیا۔ صدیق اکبر تو جانشینِ اکبر ہیں، ان کا تو یہ حال ہے، اور دوسرے خلیفہ جس کو خدا سے دعائیں کر کر کے مانگا اس کا یہ حال ہے کہ وہ تلوار لیے پھرتا ہے، اصل میں دونوں محبت کے جلوے ہیں، بات کچھ بھی نہیں، جن لوگوں کی نگاہ ہے انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ دونوں جلوے محبت ہی کے ہیں، ایک کے دل پر سکون اور طمانینت کا غلبہ تھا کہ کوہِ استقامت بن گیا، مصیبت کو مصیبت سمجھنے کے باوجود خدا کی یاد میں اتنا محو ہوا، اور اس نے موت کے صدمے کو بھلانے کے لیے خدا سے اتنا گہرا تعلق قائم کر لیا کہ وہ عظیم ترین سیلاب اور طوفان جیسا صدمہ ہوا بن کے سر سے گزر گیا، یہ نہیں کہ اس کے دل پر صدمے کی کیفیت کوئی نہ تھی، اگر صدیق اکبر کے دل کا کوئی آپریشن کر سکتا تو شاید اس کے کئی ٹکڑے نکلتے، لیکن ان کے صبر و استقامت کی انتہا یہ تھی جو صبر حضور ہی کے صبر سے مستفاد تھا، آپ نے اتنا ضبط کیا کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کی چیخیں آپ نے بند کرا دیں، ماتم نہیں ہونے دیا، واویلا نہیں ہونے دیا، یہ

صدمہ فطری اور طبعی تھا، اور ذاتِ گرامی وہ آنکھوں سے اوجھل ہوئی کہ جس کا غم کائنات کے تمام غموں پر بھاری ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اللہ کی بہت بڑی حکمت تھی کہ صدیقِ اکبر کو پیغمبر کا صبر بخش دیا۔

جس طرح تیس برس اپنوں اور بے گانوں کے ظلم وستم کا نشانہ بن کر اس ذاتِ گرامی نے پہاڑوں سے زیادہ استقامت دکھائی، صدیق پر وہی جلوہ اس وقت طاری تھا، یہ بھی محبت نبی کا اثر تھا، اور عمر بن خطاب پر وہ بے چینی اور بے تابی طاری ہوگئی، جو حضور ﷺ پر بھی اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے پر کبھی طاری ہوا کرتی تھی، حضور ﷺ پر ابتلائی وحی کے بعد اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت فاصلہ لمبا ہوگیا، اور بعض روایات میں ہے کہ ایک آیت کے بعد دو ڈھائی سال تک وحی نہیں آئی، حضرت جبرئیل نے اپنی شکل نہیں دکھائی تو حضور ﷺ کی بے چینی اتنی بڑھ گئی آپ کوہِ صفا پر تشریف لے جاتے، جبلِ ابوقبیس پر چلے جاتے تھے، اور آسمان کو بار بار دیکھتے تھے، خود فرمایا کئی دفعہ میرا جی چاہا کہ میں یہاں سے گرا کر اپنے آپ کو ختم کرلوں، قریش کہتے تھے کہ تیرا خدا کہاں ہے؟ وہ تو جو کہتا ہے مجھے اس نے فرشتہ بھیج کر بلایا ہے اور خدا کی وحی کا برقی تعلق میرے دل میں آیا ہے، اور میں نبی بن گیا ہوں، وہ کہاں ہے تیرا خدا؟ یہ حضور ﷺ پر بہت شاق گزرا، جو کیفیت عشق ومحبت میں حضور کی اللہ کے ساتھ قائم کرنے میں ابتدائے وحی میں رہی ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ فراق کی وہی کیفیت عمر بن خطاب کو بخش دی گئی، ابوبکر پر صبر واستقامت کا جلوہ ڈال دیا گیا اور عمر ابن خطاب پر بے چینی اور محبت کی بے تابیوں کا جلوہ ڈال دیا گیا، باتیں دونوں نبی سے مستفاد ہیں، صدیق اگر اتنے مستقیم نہ ہوتے تو صبر واستقامت کا مفہوم ہی ختم ہوجاتا، اور عمر اگر اتنے بے چین اور بے قرار نہ ہوتے تو عاشقوں کے زمرے میں شمار کون ہوتا؟

امام ابن تیمیہ نے اور دوسرے بزرگوں نے یہ فرمایا ہے کہ اصل میں عمر ابن خطاب کو یہ مغالطہ ہوا کہ شاید حضور ﷺ پر کوئی تجلی خاص پڑی ہے اور آپ بے ہوش ہو گئے ہیں، وفات نہیں ہوئی، یہ نہیں ہے کہ ہمیں تو تیرہ سو سال کے بعد موت کا یقین ہوا اور عمر ابن خطاب کو یقین نہ ہو موت کا۔

جس صحابی نے رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھ کر دو سال کے اندر سورۂ بقرہ درساً درساً پڑھی ہو، ہم اگر کسی عالم کے پاس بیٹھ کر دو سال میں ایک کتاب پڑھ لیں تو فخر سے سر اونچا کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں کتاب چھ مہینے میں نہیں ختم کی بلکہ فلاں محقق کے پاس بیٹھ کر دو سال اس پر مغز ماری کی، ان کی مادری زبان عربی، قبیلہ ان کا قریش اور معلم ان کا وہ انسانِ کامل جس کو خدا براہِ راست سکھانے پڑھانے والا ہو، افصح العرب والعجم، جس کی زبان مبارک سے اگر لعاب کا ایک قطرہ زمین پر گر پڑے، تو وہاں سے فصاحت وبلاغت کے چشمے پھوٹ پڑیں، وہ

سمجھانے والی ذات ہو، اور سمجھنے والا وہ شخص جس کو حضور ﷺ نے اپنے الہامی خواب کے مطابق فرمایا: "رَأَيْتُ عَبقَرِيًّا يَفْرِيْ فَرِيَّهٗ "میں نے وہ غیر معلومی انسان دیکھا، جنات کی طرح غیر معمولی بالکل غیر فطری علامات والا انسان جس کو عربی میں عبقری اور نابغہ کہتے ہیں، معاذ اللہ بے عقل کے کام کرتا پھرے؟ بات یہ نہیں، نبی ﷺ کی زندگی کو دیکھ کر صحابۂ کرام کو یہ یقین تھا کہ انبیاء کے حالات بعض اوقات ان کی حقیقت پتہ نہیں چل سکتی، جب تک نبی آپ وضاحت نہ کرے، جیسے حضور ﷺ پر وحی آتی تو حضور خاموش ہوجاتے تھے، وحی آنے کے وقت، بعض دفعہ پرانے صحابہ کو یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ خاموشی کیوں ہے؟

انہوں نے پوچھنے کی کوشش کی ایک دوسرے سے، جب ایک آدھ دفعہ تجربہ ہوگیا کہ یہ خاموشی جبرئیل کے آنے کے وقت ہوتی ہے، تو پھر جب کسی نئے صحابی نے پوچھا تو فرمایا: "أُسْكُتْ" چپ کر "إنّه قد يوحى إليه" تمہیں معلوم نہیں اس وقت وحی آرہی ہے؟ جبرئیل کے ساتھ خدا کے ساتھ رابطہ قائم ہے، تو عمر ابن خطاب نے یہ سمجھا کہ شاید یہ کیفیت جو ہوئی ہے بخار کے بعد، شاید کوئی قریب کی تجلی خاص پڑی ہے کہ حضور ﷺ پر بے ہوشی طاری ہوگئی ہے؟ چناں چہ علامہ ابن سید الناس مصری نے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک "غشي عليه كما غشي على موسى" کہ جیسے موسیٰ کو کوہِ طور پر غشی آگئی تھی، حضرت عمر ابن خطاب کے دل میں یہ بات آئی کہ حضور ﷺ پر بھی تجلی کی وجہ سے غشی طاری ہوگئی، موت نہیں ہوئی، یہ مطلب نہیں کہ عمر ابن خطاب کو موت کے آنے کا یقین نہیں تھا، یہ کون تصور کرسکتا ہے؟ ایک عام آدمی سمجھتا ہے کہ موت یقینی ہے، سب دنیا کی مصیبت بلائیں ٹل سکتی ہیں، لیکن موت ٹل نہیں سکتی، یہ تو آج کا جاہل انسان جانتا ہے، پھر نبی کا وہ صحابی جو دوسرے درجے میں خلیفہ بننے والا ہے، اور نبی کا جانشینی کا حق ادا کرنے والا ہے، وہ آدمی اس کے سوا کچھ نہ سمجھ سکتا تھا، تو میں نے جب یہ حالات پڑھے بطور ایک طالب علم کے، تو مجھے محسوس ہوا کہ اصل میں یہ مسلمانوں کی بالکل مجبوری ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں اتنے آگے نکل جاتے ہیں، اس لیے کہ جتنا عجیب وغریب ممدوح ہوگا، جتنا بلند وبالا محبوب ہوگا اتنی ہی اس کی جذب وکشش زیادہ ہوگی، اتنی ہی اس کی تعریف کا تقاضہ شدید ہوگا، اتنی ہی اس کی محبت یعنی کشش تیز ہوگی، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اثر ہے امت پر یہ بالکل خدا کی تقدیر کے اور فطرت کے عین مطابق ہے، یہ نہ ہوتا تو ہمیں تعجب ہوتا اور ہم یہ سمجھتے کہ شاید یا تو ہمارے ایمان مسخ ہوگئے ہیں، یا حضور ﷺ کے متعلق اللہ نے کوئی پردہ ڈال دیا ہے کہ ہمارے دل میں وہ کشش نہیں ہوتی، اور اگر کوئی کشش موجود ہے تو یہ لکھ لیجئے کہ قیامت پر قیامت آسکتی ہے، یہ کشش مسلمانوں کے دل سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی، قیامت تک رہے گی جب تک مسلمانوں کا وجود اس دنیا میں اللہ کے نزدیک مقدر ہے یہ محبت رہے گی، اور فاسق

وفاجر کا سر بھی حضور ﷺ کا نام آتے ہی ادب سے جھک جائے گا، یہ ایک فطری چیز ہے، یہ نبی کی امت ہونے کا وہ فطری تعلق ہے جس کو دنیا کا کوئی کفر، کوئی فسق وفجور، کوئی گناہِ کبیرہ بھی مسلمان کے دل سے نہیں نکال سکتا، وہ وقتی طور پر بد اعمالیوں میں مشغول ہوجائے گا، خدا کا بے لحاظ ہوجائے گا، لیکن حضور ﷺ کی روحانی کشش کا یہ عالم ہے کہ ایک دفعہ اس کے سامنے نام لے دو کہے گا جی میں گناہ گار ہوں، آپ نے بڑی سرکار کا نام لیا ہے، مجھ میں بولنے کی ہمت نہیں۔

انبیاء کے سوا کون ہے جس کی اتنی بے تابانہ اور مجبورانہ محبت مخلوق کے دلوں کی جڑوں کے اندر گھسی ہوئی ہو، یہی پیغمبر ہونے کی ایک نشانی ہے کہ جب وہ آتا ہے تو پھر امت کے دلوں میں اس کے لیے محبت کے دروازے کھل جاتے ہیں، اور اس کی محبت کا دریا جوش مارتا ہے، تو یہ مبالغہ نہیں۔ (تعمیر افکار، سیرت نمبر: ص/ ۱۷۳ تا ۱۷۷)

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

سیرت کی ضرورت واہمیت

سیرت کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم (جدت پسندی سے متأثر ہیں بلکہ مؤید وداعی گذرے ہیں البتہ مضمون سے ایسے مخدوش مواد کو حذف کیا گیا ہے پھر بھی اگر کوئی بات ہو تو نشاندہی کی گذارش ہے) فرماتے ہیں:

جب ہم مطالعہ سیرت کی ضرورت اور اہمیت پر بات کرتے ہیں، تو ہمارے سامنے دو مختلف ضرورتیں، یا دو مختلف اہمیتیں ہوتی ہیں، ضرورت واہمیت کی ایک سطح مسلمانوں کے لیے اور ایک دوسری سطح غیر مسلموں کے لیے ہے، مسلمان جن اسباب اور محرکات کی بنیاد پر سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ کرتے ہیں ان کی نوعیت اور ہے، جب کہ غیر مسلم جب سیرت النبیا کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ اس کے اسباب اور محرکات دوسرے ہوتے ہیں، پھر مسلمانوں میں مختلف لوگوں کی ضروریات اور ذہنی سطح کے لحاظ سے سیرت النبی کے مطالعہ، ضرورت اور اس کی اہمیت کی الگ الگ سطحیں ہیں، عامۃ الناس کی سطح اور ہے، تعلیم یافتہ افراد کی سطح اور ہے، اور مختصین کی سطح اور ہے۔

پھر جب ہم اہمیت کے بات کرتے ہیں تو دورِ جدید میں سیرت کی اہمیت کے بعض نئے پہلو اور بعض نئے

جہتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، سیرت کے مطالعہ کی تہذیبی اہمیت بھی ہے، بین الاقوامی اہمیت بھی ہے، سیرت کے مطالعہ کی علمی اور تاریخی اہمیت بھی ہے، اس کی وجہ سے دورِ جدید کو، چاہے وہ مسلمانوں پر مشتمل ہو یا غیر مسلموں پر، سیرت کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا چاہئے۔

سیرت ایک لامتناہی اور متلاطم سمندر ہے، علم سیرت محض ایک شخصیت کی سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تہذیب، ایک تمدن، ایک قوم، ایک ملت اور ایک الٰہی پیغام کے آغاز اور ارتقاء کی ایک انتہائی اہم، انتہائی دلچسپ اور انتہائی مفید داستان ہے، سیرت ایک ایسا دریائے متلاطم ہے جس کے درہائے ناسفتہ لامتناہی ہیں، ایک مغربی مستشرق نے، کسی دوست نے نہیں بلکہ ایک دشمن نے، یہ اعتراف کیا تھا کہ آں حضرت ﷺ کے سیرت نگاروں کا سلسلہ لامتناہی ہے، لیکن اس میں ایک جگہ پانا قابلِ عزت اور باعثِ شرف ہے۔

قرآن مجید کے بارے میں حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ایک طویل حدیث میں ایک اہم وصف ارشاد فرمایا تھا، وہ ارشاد جس کو سیدنا علی بن ابی طالب نے روایت کیا ہے، اور محدث طبرانی نے اس کی تخریج کی ہے، اس حدیث میں حضور ﷺ نے قرآن پاک کے دس بارہ اوصاف بیان فرمائے، ان میں ایک وصف یہ بھی ہے کہ " **لا تنقضي عجائبه** " یعنی قرآن مجید کے عجائب وغرائب کبھی بھی ختم نہیں ہوں گے، قرآن مجید سے ہمیشہ نئے نئے مطالب نئے نئے معانی نکلتے چلے جائیں گے، اور ہر آنے والا دن قرآن پاک کے حقائق اور معارف کی ایک نئی دنیا لے کر آئے گا، علامہ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عالم قرآنی ہر دور میں اپنے آپ کو بے نقاب کرتا ہے، اور نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کے بطن میں ابھی کتنے عوالم قرآنی پنہاں ہیں، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کتنے مناظر اور مشاہد انسانوں کے سامنے آئیں گے، اسی طرح صاحب قرآن کی سیرت اور ارشادات میں پنہاں حقائق ومعارف بھی، کم از کم ہم محدود انسانوں کی بساط کے لحاظ سے لامتناہی ہیں۔

علامہ اقبال نے ایک بہت ہی لطیف بات ارشاد فرمائی ہے ؎

لوح بھی تو، قلم بھی تو،

ترا وجود الکتاب

یہ شاعرانہ انداز کا کوئی مبالغہ نہیں ہے، ترا وجود الکتاب وہی بات ہے جو سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمائی تھی، آپ سے ایک بار کسی نے پوچھا تھا کہ: اماں جان! رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کی تفصیل آپ بتا سکتی ہیں؟ آپ نے جواباً فرمایا: کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ پوچھنے والے نے عرض کیا: جی ہاں! پڑھا ہے،

ارشاد ہوا: "کان خلقه القرآن" آپ ﷺ کے اخلاق عین قرآن تھے، یعنی وہی کچھ تھے جو قرآن میں لکھا ہوا ہے، لہٰذا قرآن مجید اگر قرآن صامت یعنی خاموش قرآن ہے، تو حضور ﷺ کا وجود گرامی قرآن ناطق ہے، اگر قرآن صامت کے عجائب وغرائب لامتناہی ہیں، تو قرآن ناطق کے عجائب وغرائب کیسے متناہی ہو سکتے ہیں، وہ بھی لامتناہی ہیں۔

اس کی ایک دلیل یہ کہ سیرت نگاروں کا ایک سیلاب نما سلسلہ ہے، جو پہلی صدی ہجری سے آج تک بغیر کسی تعطل کے چلا آرہا ہے، اور ہر سیرت نگار کو یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید ابھی تو صرف کام کا آغاز ہوا ہے، اور ابھی تو ایک نئی دنیا موجود ہے، جس کو سر کرنا ہے، ابھی تو تحقیق کا ایک نیا ہفت خواں سامنے آیا ہے جس کو عبور کرنا ہے، علم سیرت کی یہ روز افزوں وسعت خود اپنی جگہ ذات رسالت مآب ﷺ کا ایک معجزہ ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں
رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناسفتہ در رگ
تاک است

یہ احساس ہر اس سیرت نگار یا علم سیرت کے طالب علم کو ہوتا ہے، جو کسی پہلو سے سنجیدہ تحقیق کی خاطر ذخائر سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے۔ (محاضرات سیرت: ص/ ۱۴ تا ۱۶)

سیرت کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر مفتی محمد مظہر بقاء تحریر فرماتے ہیں:

معلمِ حقیقی جل جلالہ نے بھی اپنی کتاب میں مسلمانوں کے لیے زندگی گزارنے کا ایک مکمل اجمالی اور اصولی خاکہ پیش کر دیا ہے، اور ایک نمونہ بنا کر حکم دیا کہ زندگی کے خاکے میں اس نمونے کے مطابق رنگ بھرنا ہے، اس نمونے کے مطابق خاکے میں رنگ بھرنے یا نہ بھرنے، یا اس میں کمال ونقصان کے اعتبار ہی سے انسان ناکامیابی یا اعلیٰ درجے کی کامیابی کا مستحق ہوگا۔

وہ کتاب جس میں معلمِ حقیقی نے زندگی گزارنے کا خاکہ پیش کیا، قرآن کریم ہے، جس کے بارے میں ایک جگہ فرمایا گیا: {یٰاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ، وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ} "اے لوگو! تمہارے پاس آئی ہے نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور شفا دلوں کے روگ کی اور ہدایت اور رحمت مومنوں کے لیے۔" (سورۂ یونس، آیت ۵۷)

اور وہ نمونہ جس کے مطابق اس خاکے میں رنگ بھرنا ہے، سرکارِ دو عالم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے، جس کے بارے میں فرمایا گیا: {لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ} ''بلاشبہ تمہارے لیے رسول اللہ میں اچھی روش ہے۔'' (سورۂ احزاب، آیت ۲۱)

پھر جا بجا اس ذاتِ گرامی کی اطاعت واتباع کا حکم دیا گیا، اور یہاں تک فرمایا گیا کہ: {من يطع الرسول فقد أطاع الله} ''اور جس نے رسول کی اطاعت کی تحقیق اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

(سورۂ نساء، آیت ۸۰)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب حضور ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو آپ نے جواب دیا: ''كان خلقه القرآن'' ''آپ کے اخلاق قرآن تھے۔'' (طبقات ابن سعد :۱/ ۱۷۵، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

یعنی قرآن کریم میں زندگی گزارنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، حضور ﷺ کی زندگی اسی کی عملی تفصیل تھی، کیا فہم وفراست ہے کہ ایک جملے میں پوری سیرتِ طیبہ کا اجمالی خاکہ پیش کرکے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریا کوزے میں بند کردیا۔

رسول اللہ ﷺ نے زندگی کا جو عملی نمونہ پیش فرمایا اگر وہ سامنے نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل بھی ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے: {اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ} ''نماز قائم کرو۔'' [سورۂ بقرہ، آیت ۴۳، ۸۳، ۱۱۰ وغیرہ] کے ذریعے نماز کا حکم دیا لیکن اس حکم کی تعمیل کس طرح ہوگی، اس کی تفصیل قرآن کریم میں نہیں، یہ تفصیل حضور ﷺ کی زندگی میں ملتی ہے، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

''صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ''۔ ''اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔''

(صحیح بخاری: ص/ ۱۲۹، رقم الحدیث: ۶۳۱، بیروت، فتح الباری: ۲/ ۱۴۶، مکتبہ دار السلام الریاض، عمدۃ القاری: ۵/ ۲۱۳، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ ملتان، پاکستان، مشکوۃ: ۱/ ۲۱۵، رقم الحدیث: ۶۸۳، المکتب الاسلامی بیروت)

اللہ تعالیٰ نے: {آتوا الزكوة} ''اور زکوۃ ادا کرو۔'' [سورۂ بقرہ، آیت ۴۳، ۸۳، ۱۱۰ وغیرہ] کا حکم دیا، لیکن قرآنِ کریم اس کی تفصیلات سے ساکت ہے، اور جب تک رسول اللہ ﷺ کی سیرت کی طرف رجوع نہ کیا جائے، اس حکم پر عمل کرنا ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے: {وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ} ''اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے لیے بیت اللہ کا حج فرض

ہے۔" [سورۂ آل عمران، آیت ۹۷] کا حکم دیا، لیکن اس کی پوری تفصیل حضور ﷺ کی زندگی میں ملتی ہیں، اسی لیے آپ نے فرمایا: "خذوا عني مناسككم" "اپنے حج کے افعال مجھ سے سیکھو۔"

(فتح الباری لابن حجر: ۱/ ۲۱۷، دار الفکر بیروت)

غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں زندگی کا جو خاکہ بتایا ہے، اس میں رنگ بھرنا تو درکنار حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے بغیر یہ معلوم ہونا بھی ممکن نہیں کہ وہ رنگ کیا ہیں، جو اس خاکے میں بھر جائیں گے۔

حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ جن امور پر مشتمل ہے، ان میں سے بعض عبادات سے متعلق ہیں، اور بعض عادات سے، مثلاً نشست و برخاست، طعام ولباس وغیرہ، عبادات سے متعلق امور میں فرائض بھی ہیں اور نوافل بھی، یہی نوافل ہیں جو کبھی کبھی یا اکثر یا ہمیشہ کرنے یا نہ کرنے کے تفاوت سے مستحبات یا سنن غیر مؤکدہ ومؤکدہ، یا واجبات کہلاتے ہیں، اور ان کی اتباع میں بھی درجات کا یہی تفاوت ہے، عبادتوں سے متعلق سنتوں کو مستقلاً چھوڑ دینے سے آخرت میں مواخذے یا کم از کم حضور ﷺ کی شفاعت سے محرومی کا اندیشہ ہے۔

البتہ عادات سے متعلق امور کے ترک پر اس طرح کا اندیشہ نہیں، لیکن عادی امور میں بھی حضور ﷺ کی اتباع پر اجر وثواب کا استحقاق ہوتا ہے، اور اسی سے ایمان میں حلاوت پیدا ہوجاتی ہے، اسی طرح جس طرح کوئی شخص شربت پینا چاہے، تو شکر کو پانی میں گھول کر پی لینے سے مقصد پورا ہوجائے گا، لیکن اگر اس میں اونٹا ہوا سوندھا دودھ اور کچھ خوشبوئیں بھی ملادی جائیں، تو اس کی لذت میں کئی گناہ اضافہ ہوجاتا ہے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے سیرت رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا ہمیں جو نمونہ ملتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ عبادات وعادات کے فرق کے بغیر تمام امور میں حضور ﷺ کی اتباع کیا کرتے تھے۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ کھانا تناول فرمارہے تھے، ان کے پاس ایک ترک فوجی افسر بیٹھا تھا اور ایک ترجمان بھی، حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا زمین پر گر گیا، انہوں اٹھا کر تہبند سے صاف کیا اور کھالیا، ترجمان نے کہا کہ یہ لوگ اسے سخت معیوب شمار کرتے ہیں، حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ ان احمقوں کی وجہ سے میں اپنے حبیب ﷺ کی سنت کو ترک نہیں کرسکتا۔

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما قافلے کے ساتھ مکہ مکرمہ جارہے تھے، ایک جگہ انہوں نے اونٹ رکوایا اور ذرا فاصلے پر اس طرح بیٹھے جیسے پیشاب کے لیے بیٹھتے ہیں، اور پیشاب کئے بغیر اٹھ کھڑے

ہوئے، دریافت کرنے پر فرمایا کہ تقاضا نہ ہونے کے باوجود میں یہاں اس ہیئت سے اس لیے بیٹھا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس جگہ پیشاب کے لیے بیٹھا دیکھا تھا۔

ایک مرتبہ لوگوں نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دیکھا کہ اونٹنی کی نکیل پکڑے ایک ویران منہدم مکان کے گرد چکر لگا رہے ہیں، لوگوں نے اس بظاہر عبث فعل کی وجہ دریافت کی، تو فرمایا کہ میں نے ایک بار حضور ﷺ کو اسی طرح اس مکان کے گرد چکر لگاتے دیکھا ہے۔

غرض یہ کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین عبادات میں تو رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرتے ہی تھے، عادات بلکہ اتفاقی امور میں بھی حضور ﷺ کی اتباع کو سرمایۂ سعادت اور ذریعۂ نجات سمجھتے تھے۔

حضور ﷺ کی سیرت خواہ وہ عبادات سے متعلق ہو یا عادات سے، ظاہر ہے کہ اس کا اتباع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ کی سیرت کا علم نہ ہو۔ (السیرۃ عالمی: ص/۲۱ تا ۲۵، شمارہ نمبر: ۲)

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

سیرت کی ابدیت

سیرت کی ابدی حفاظت کے چار بڑے عوامل برکار ہیں، جو حضور سرور کائنات ﷺ کی سیرت کے لیے ابدیت کا لازوال پیغام ہیں:

(۱) قرآن (۲) روایات (۳) اہل علم کے سینے (۴) متبعین سنت کا عمل

قرآن سیرت کا اولین سرچشمہ:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سوال کیا گیا کہ نبی کریم ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: "کان خلقه القرآن" آپ ﷺ کی سیرت دیکھنی ہو تو قرآن کو دیکھ لو، اول سے لے کر آخر تک قرآن پڑھ جاؤ، یہی آپ کا علم ہے، یہی آپ ﷺ کا عمل ہے، اور یہی آپ ﷺ کے احوال ہیں، گویا کہ قرآن سیرتِ مقدسہ کا اولین سرچشمہ ہے۔

جہاں تک قرآن پاک کی حفاظت کا تعلق ہے، یہ کتاب ایک حدیثِ متواترہ ہے، جس کا ایک ایک حرف محفوظ، زیر وزبر تک سب محفوظ، رکوع الگ گنے ہوئے، حروف گنے ہوئے، سورتیں گنی ہوئیں، حتی کہ محدثین

نے اعراب تک گن رکھے ہیں، اس قدر تواتر کے ساتھ اور سند اور تاریخ کی حیثیت سے متصل کتاب، آج تک دنیا کے کسی کونے میں موجود نہیں، پھر یہ کہ حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت محض کاغذوں سے نہیں کرائی بلکہ امت کے سینوں کو اس کی حفاظت گاہ بنایا، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

{بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ}۔

''بلکہ وہ لکھی ہوئی نشانیاں ہیں جو اہل علم کے سینوں میں موجود ہیں۔'' [العنکبوت:۴۹]

اس کی حفاظت گاہ مسلمانوں کے قلوب کو قرار دیا گیا، جہاں نہ کوئی ڈاکو پہنچتا ہے نہ کوئی چور، اور نہ ہی شیطان کا اثر غالب ہوسکتا ہے، کاغذ جل سکتے ہیں، لکھنے والے بدل سکتے ہیں، لیکن قلوب میں جو چیز محفوظ ہے نہ جل سکتی ہے، نہ بدلتی ہے، اس لیے جب قرآن نبی کریم کی سیرت کا نام ہے، تو دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ سیرتِ مقدسہ بھی قلوب میں محفوظ ہے، کاغذوں میں نہیں، بلکہ مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ ہے، اور ایک ایک ذرہ تک محفوظ چلا آتا ہے، اور یہ ہزاروں کی تعداد میں لکھی گئی قرآن کریم کی تفسیریں سیرتِ مطہرہ کی تفسیریں ہیں، جو چودہ سو برس سے چلی آرہی ہیں، اور کتب خانے ان سے بھرے پڑے ہیں، خاص طور پر جب جبرئیل علیہ السلام بیچ میں ہیں اور یہ کتاب مروی عن الحق ہے، اور اس کی روایت بھی حضور ﷺ پر آئی ہے، تو اس کے مبنی برحق ہونے میں بھی کوئی شک نہیں، کیوں کہ اللہ کا نام بھی امین ہے، جبرئیل کا لقب روح الامین ہے، اور حضور ﷺ کا قلب بھی امین ہے۔ امین سے روایت چلی، امین کے ذریعہ پہنچی، اور امین تک پہنچی، تو تین امانت داروں کے ہونے کی بنا پر اس کی قطعیت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، اس لیے فرمایا:

{اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ○ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ○ مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ○}۔ [التکویر:۱۹تا۲۱]

راوی قابلِ اعتماد ہے، منشائے خداوندی کا پیروکار ہے، کریم النفس ہے، اس کے ساتھ طاقت ور بھی ہے، دبنے والا نہیں دور سے کلام نہیں سن رہا، بلکہ عرش کے پاس متمکن ہے اور ٹھیک ٹھیک سن کر پہنچا رہا ہے، پھر جبرئیل امین رتبے میں بہت بلند ہیں، کیوں کہ تمام ملائکہ ان کی اطاعت کرتے ہیں، اور وہ سارے فرشتوں کے سردار ہیں، اس لیے ان کی روایت پر اعتماد کیوں نہ ہو، پھر فرمایا:

{وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا} [النساء:۱۲۲]

{وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا} [النساء:۸۷]

''کہ اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہے؟''

حق تعالیٰ شانہ قرآن کے بارے میں فرمارہے ہیں کہ سچے کا کلام ہے، سچے کے ذریعے آیا ہے، سچے تک پہنچا ہے، اس لیے اسے مانو، جس طرح قرآن دلائل پر مبنی اسی طرح اس کا سیرت ہونا بھی دلائل پر مبنی اور قطعی طور پر واضح ہے۔

جب حق تعالیٰ شانہ نے {اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ}[الحجر:۹] کے الفاظ سے قرآن کی حفاظت کا وعدہ دیا، تو یہ وعدہ یکساں طور پر سیرتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے بھی تھا، کیوں کہ ان دونوں کی حفاظت اس نے ہم پر نہ چھوڑی بلکہ اپنے ذمہ لے لی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن اور سیرت ہر لحاظ سے محفوظ ہیں، اگر قرآن کی حفاظت بھی ہم پر چھوڑ دی جاتی تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا، جو توریت، انجیل کا اور ان کے لانے والوں کا ہوا، اس لیے کہ ان کی حفاظت ان کی امتوں کے سپرد کی گئی تھی، جیسا کہ فرمایا:

{اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَالرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ}۔[المائدۃ:۴۴]

لیکن اس کے برخلاف قرآن اور صاحبِ قرآن کی سیرت کی حفاظت کا ذمہ خود حق تعالیٰ نے لیا اور فرمایا: ''ہم ہی نے اسے اتارا ہے اور اس کی حفاظت بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔''

ابدیتِ سیرت کا دوسرا اہم عامل:

ابدیتِ سیرت النبی ﷺ کا دوسرا سب سے بڑا عامل یہ ہے کہ آپ کی زندگی کی ایک ایک ادا روایات میں بھی محفوظ ہے، سند متصل اور سند صحیح کے ساتھ محدثانہ طریقے سے، اور درایت کے طور پر بھی، اور وہ بھی راویوں کے احوال اور ان کے پورے کردار کے ساتھ، حتی کہ ہر لحاظ سے آپ کی سیرت کلیۃً محفوظ ہے، اور چونکہ سب سے پہلی بات سند ہی ہوتی ہے جو کہ عقلی چیز نہیں بلکہ نقل کی جانے والی شے ہے، جس میں اسناد روایت کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے، اور سند میں رجال پیش نظر ہوتے ہیں، تا کہ روایت کرنے والے مشتبہ نہ ہونے پائیں، اس لیے اسماء الرجال کے مبسوط فن تحقیق کے ساتھ سیرت مقدسہ کا ہر پہلو احادیث میں کاملاً محفوظ ہے، بلکہ صحاحِ ستہ، کتب احادیث، مغازی کی کتابیں، تاریخی دستاویزات، کتب دلائل، کتب شمائل، مکہ و مدینہ کے حالات پر مبنی کتابیں سب کی سب سرورِ دو عالم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ ہی کا علمی سرمایہ ہے، جو لاکھوں کی تعداد میں لکھی گئی ہیں۔

اہل علم کے سینوں کا ذخیرہ جاودانی:

قرآن وحدیث کے علاوہ ہر دور میں اہل علم کے سینے سیرتِ مقدسہ کی حفاظت کا زندہ جاوید خزانہ رہے

ہیں کہ صالحین کے بعد خلف صالحین سینہ بہ سینہ سیرت مقدسہ اور علوم نبویہ کو نسلاً بعد نسلٍ تازہ بہ تازہ آگے پہنچاتے چلے گئے ہیں، اور آئندہ بھی قیامت تک کے لیے یہ فریضہ سرانجام دیتے جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس امت میں علم کا تسلسل ہر دور میں قائم رہے گا، جو بھی علم لینا چاہے گا وہ جہالت میں نہیں رہے گا، رب تعالیٰ اس کے لیے علم کے دروازے کھول دے گا، جیسا کہ فرمایا: {وَالَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا}۔ "جو ہمارے رستے میں جدوجہد کرے گا تو ہم ضرور اسے حق کا رستہ دکھائیں گے۔" [العنکبوت:٦٩]

{لنهدينّهم} میں "ل" تاکید ہے، یعنی ہم ضرور بالضرور اس کی رہنمائی کریں گے، اور وہ یقینا حق تعالیٰ سے فیض یاب ہوگا، تو جس طرح قرآن کے ذریعے اور احادیث کے ذریعے سیرت مقدسہ کی حفاظت کا وعدہ ہوا، اسی طرح ہر دور میں اہل علم کی ایک جماعت کا بھی وعدہ ہوا جن کے سینوں میں علم نبوی تازہ بہ تازہ محفوظ ہوگا، جن کا علم خود ساختہ نہیں ہوگا، قوت مطالعہ اور سوچ بچار کا علم نہیں ہوگا، بلکہ اوپر سے سند لے کر وہ اس طرح علم کو حاصل کریں گے کہ الفاظ، کیفیات، تعبیرات بلکہ ذہن تک سلف صالحین سے حاصل کریں گے، اور اپنے پاس سے صرف جہد وکوشش یعنی اجتہاد کا حصہ ڈالیں گے کہ جس کے نتیجہ میں انہیں ہر پیش پا افتادہ مسئلے کا حل سیرت مقدسہ کی صورت میں سامنے کھلا مل جائے گا، اور وہ ہرگز کسی قسم کے شک وشبہ اور تحیر میں مبتلا نہیں ہوں گے۔

متبعینِ سنت کا عملی مظاہرہ:

سیرتِ مطہرہ کی حفاظت کا چوتھا سب سے بڑا عامل ہر دور میں متبعینِ سنت کا مظاہرۂ عمل ہے کہ ہر زمانے میں ایسے علما وصلحا پیدا ہوتے ہیں کہ جن کا عمل ہی سنت نبوی کا واضح ثبوت ہے، گویا کہ اس طرح سیرت پاک قرآن وسنت کے علاوہ متبع سنت شخصیتوں کے ذریعے بھی محفوظ ہے اور محفوظ رہے گی، اس لیے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ قیامت آنے تک امت میں ایک جماعت حق پر آتی رہے گی، جن کی موجودگی سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا، چناں چہ فرمایا:

"لا تزال طائفة من أمتي منصورين لا يضرّهم من خذلهم حتى تقوم الساعة"

بلکہ ایک اور مقام پر یوں فرمایا:

"لا تزال طائفة من أمتي قوّامة على أمر الله لا يضر من خالفها"

"امت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پر رہے گی، جن کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کی جائے گی، اور ان کی مخالفت کرنے والا یا ان کو روکنے والا انہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔" (ابن ماجہ: ص/ ۲، باب اتباع سنۃ رسول اللہ ﷺ، قدیمی)

اس لیے ہزار ہا علماء محدثین، حکماء اور ائمہ متبعین سنت کا عمل اسی طرح سے چلا آرہا ہے، جس طرح آنحضرت ﷺ کا تھا، صرف کمی پیشی کی بات ہے، حقیقت ایک ہی ہے، اس لیے آج بھی ایسی ہستیاں موجود ہیں جو اتباعِ سنت کی دلیل ہیں، اور ایک ایک معاملے میں اور ایک ایک حالت میں سنت کی پیروکار ہیں، تاریخ بتاتی ہے اور خاص طور پر علماء ہند کا شاندار ماضی گواہ ہے کہ پھانسیاں کھڑی کی گئیں، لیکن پھر بھی اتباع سنت میں فرق نہیں آیا، غرض کہ چودہ سو سال کی تاریخ ایسی ہزاروں مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ہر زمانے میں سنت پر ڈٹ کر چلنے والے اور سنت پر عمل پیرا ہونے والے اس قدر تعداد میں تواتر سے موجود رہے کہ ان کا اتباع ہی سیرت مقدسہ کی عملی حفاظت کا ذریعہ ہے، بلکہ آج بھی ایسے صالحین موجود ہیں جن کے عمل کو ہی دیکھ کر معلوم کیا جاسکتا ہے کہ سیرت پاک کا عملی درس کیا ہے؟ (تعمیر افکار، سیرت نمبر: ص/ ۳۷۵ تا ۳۷۹)

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

خصائصِ سیرت النبی ﷺ
سیرت کی جامعیت کے چند بنیادی اصول

(از قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ مہتمم دار العلوم دیو بند)

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفی۔۔۔:

سرکارِ دو عالم، فخر بنی آدم، رسول الثقلین، حضرت محمد مصطفی ﷺ کی سیرتِ مقدسہ اپنی ظاہری و باطنی وسعتوں اور پنہائیوں کے لحاظ سے کوئی شخصی سیرت نہیں، بلکہ ایک عالمگیر اور بین الاقوامی سیرت ہے، جو کسی شخصِ واحد کا دستورِ زندگی نہیں بلکہ جہانوں کے لیے ایک مکمل دستورِ حیات ہے، جوں جوں زمانہ ترقی کرتا چلا جائے گا، اُسی حد تک انسانی زندگی کی استواری و ہمواری کے لیے اس سیرت کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی چلی جائے گی۔

زمانہ اور اُس کا تمدن اپنی ارتقائی حرکت سے کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا اور کل کو نہ معلوم کہاں تک جا پہنچے، لیکن وہ کہیں بھی پہنچے اور اس کی تمدنی زندگی کے گوشے کتنے بھی پھیل جائیں اور پھیل کر زمین و آسمان اور فضا وخلا، سب ہی کو ڈھانپ لیں، پھر بھی یہ ارتقائی سیرت اور اُس کے تدیّن کے گوشے اسی حد تک تمدنی گوشوں کی

تقویم واصلاح کے لیے شاخ درشاخ ہوکرنمایاں ہوتے رہیں گے، جیسا کہ وہ اب تک زمانہ کی مدنی ترقی کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے رہے، اوران میں سکون واطمینان کی روح پھونکتے رہے ہیں۔

اس کی شرعی وجہ یہ ہے کہ آیت: {وإنک لعلیٰ خُلُقٍ عظیم} کے بارے میں جب صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ اس خلقِ عظیم کی سیرت واخلاق کے سلسلے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ: "وکان خُلُقُہٗ القرآن" آپ کا خلق (سیرت) یہ قرآن ہی تو ہے۔

اورقرآن کے بارے میں خود حضرت صاحبِ سیرت علیہ افضل الصلوۃ والتسلیم نے فرمایا کہ:

"ولا تنقضی عجائبہ ولا یخلق عن کثرۃ الرد"

اس قرآن کے عجائبات (علوم ومعارف) کبھی ختم ہونے والے نہیں اور یہ بار بار کے تکرار سے کبھی بھی پُرانا نہیں ہوگا (کہ اس سے دل اکتا جائے)۔

اس سے صاف نتیجہ یہی نکلتا ہے اورنکل بھی سکتا ہے، کہ سیرت کے عجائبات بھی کبھی منقضی ہونے والے نہیں، فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ قرآن میں یہ لامحدود عجائبات علمی صورت میں اور ذات بابرکات نبوی کی سیرت میں یہی عجائبات عملی صورت میں ہیں، گویا ایک علمی قرآن ہے جو اَوراق میں محفوظ ہے، اور ایک عملی قرآن یعنی سیرت ہے جو ذاتِ نبوی میں محفوظ ہے، اور دونوں آپس میں ایک دوسرے پر مِن وعَن منطبق ہیں، پس قرآن کا کہا ہوا حضور کا کیا ہوا ہے، اور آپ کا کیا ہوا قرآن کا کہا ہوا ہے، اس لیے قرآن حکیم کی یہ ہزاروں آیتیں درحقیقت سیرتِ مقدسہ کے علمی اور تعارفی ابواب ہیں، اور ادھر سیرت کے یہ ہزاروں گوشے قرآن کے عملی پہلو ہیں، پس قرآن میں جو چیز قال ہے وہی ذاتِ نبوی میں حال ہے، اور جو قرآن میں نقوش ودوال ہیں وہی ذاتِ اقدس میں سیرت واعمال ہیں، اس لیے سیرت سے تو قرآن کی عملی صورتیں مشخص ہوتی ہیں، اور قرآن سے سیرت کی علمی ہیئتیں کھلتی ہیں۔

اس قرآن حکیم کے مختلف مضامین سے اپنی اپنی نوعیت اور مناسبت کے مطابق سیرت کے مختلف الانواع پہلو ثابت ہوتے ہیں:

قرآن میں ذات وصفات کی آیتیں آپ کے عقائد ہیں اور احکام کی آیتیں آپ کے اعمال،
تکوین کی آیتیں آپ کا استدلال ہیں اور تشریح کی آیتیں آپ کا حال،
قصص واَمثال کی آیتیں آپ کی عبرت ہیں اور تذکیر کی آیتیں آپ کی موعظت،

خدمتِ خَلق کی آیتیں آپ کی عبدیت ہیں اور کبریاءِ حق کی آیتیں آپ کی نیابت،
اخلاق کی آیتیں آپ کا حسنِ معاشرت ہیں اور معاملات کی آیتیں آپ کا حُسنِ معیشت،
توجہ الی اللہ کی آیتیں آپ کی خلوت ہیں اور تربیتِ خلق اللہ کی آیتیں آپ کی جلوت،
قہر وغلبہ کی آیتیں آپ کا جلال ہیں اور مہر ورحمت کی آیتیں آپ کا جمال،
تجلیاتِ حق کی آیتیں آپ کا مشاہدہ ہیں اور ابتغاء وجہ اللہ کی آیتیں آپ کا مراقبہ،
ترکِ دنیا کی آیتیں آپ کا مجاہدہ ہیں اور احوالِ محشر کی آیتیں آپ کا محاسبہ،
نفی غیر کی آیتیں آپ کی فنائیت ہیں اور اثباتِ حق کی آیتیں آپ کی بقائیت،
انا اور انت کی آیتیں آپ کا شہود ہیں اور ہو کی آیتیں آپ کی غیبت،
نعیم جنت کی آیتیں آپ کا شوق ہیں اور جحیم نار کی آیتیں آپ کا وہم وغم،
رحمت کی آیتیں آپ کی رجاء ہیں اور عذاب کی آیتیں آپ کا خوف،
انعام کی آیتیں آپ کا سکون واُنس ہیں اور انتقام کی آیتیں آپ کا حزن،
حدود وجہاد کی آیتیں آپ کا بغض فی اللہ ہیں اور امن وترحیم کی آیتیں آپ کا حب فی اللہ،
نزولِ وحی کی آیتیں آپ کا عروج ہیں اور تعلیم وتبلیغ کی آیتیں آپ کا نزول،
تنفیذ اوامر کی آیتیں آپ کی خلافت ہیں اور خطاب کی آیتیں آپ کی عبادت،......وغیرہ۔

غرض کسی بھی نوع کی آیت لو وہ آپ کی کسی نہ کسی پیغمبرانہ سیرت اور کسی نہ کسی مقام نبوت کی تعبیر ہے اور آپ کی سیرت اُس کی تفسیر، جس سے صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس زرّیں مقولہ: ''وکان خلقہ القرآن'' سے قرآن اور ذاتِ اقدس نبوی کی کامل تطبیق اور صدیقۂ پاک کی علمی گہرائیوں اور ذاتی ذکاوتوں کا نشان ملتا ہے، اس لیے یہ دعویٰ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ثابت ہوتا ہے کہ اگر قرآن کے علمی عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے، تو سیرتِ نبوی کے عملی عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں، اور اگر قرآن علمی طور پر تا قیامِ قیامت اپنے شاخ درشاخ علوم سے بنی نوع انسان کی تکمیل کا ضامن ہے، تو یہ سیرتِ جامعہ بھی تا یومِ محشر اپنے شاخ درشاخ عملی اسووں سے اقوامِ عالم کی تکمیل وتسکین کی کفیل رہے گی۔

اس توجیہ واستدلال کے سلسلے میں ذرا اور آگے بڑھو تو قرآن کی شرعی تفسیر حدیث پاک ہے، قرآن اگر متن ہے تو حدیث اس کا بیان اور شرح ہے، جس سے قرآن کے مخفی گوشے مرادی طور پر کھلتے ہیں، اور مطالبِ

خداوندی نمایاں ہوجاتے ہیں، اس لیے اگر قرآن حضور کی سیرت ہے تو حدیث اس سیرت کی تفصیل ہے، اور اس لیے کتبِ حدیث کے ہزاروں ابواب وفصول درحقیقت سیرتِ مقدسہ ہی کے ابواب وفصول ہیں، جن سے گزر کر ہی آدمی اقلیمِ سیرت میں داخل ہوسکتا ہے۔

اندریں صورت کہ قرآن وحدیث سیرتِ مقدسہ کی تعبیر ہے اس نکتہ پر غور کرنا چاہیے کہ قرآن وحدیث کے مضامین کی ترتیب میں جو درحقیقت سیرتِ مقدسہ اور حیاتِ نبوی کے مراتب کی ترتیب ہے اوّلیت ایمان وعقائد کو اور پھر عبادات کو دی گئی ہے، فاتحۂ قرآن کو بھی اوّلاً ذاتِ حق پھر اُس کی ربوبیتِ عامہ پھر رحمتِ عامہ اور پھر مالکیتِ عامہ اور پھر عبادت واستعانت سے شروع کیا گیا ہے، سورۂ بقرہ کو لو تو اُس کی ابتدا بھی ایمان بالغیب اور نماز وانفاق فی سبیل اللہ سے کی گئی ہے، بہرحال قرآن میں اولیت عقائد اور عبادات کو دی گئی ہے۔

اُس کے بعد دوسرے ابواب میں دین کی تفصیل ہے، اسی طرح عموماً کتبِ حدیث میں اسی اسوۂ قرآنی کے مطابق ابواب وفصول کی ابتدا کتاب الایمان، پھر کتاب الصلوۃ، کتاب الزکوۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج وغیرہ سے کی گئی ہے۔ اس کے بعد اخلاق، معاملات، نکاح، طلاق، میراث، ہبہ، اوقاف، پھر وسائلِ معاش زراعت، تجارت، صنعت وحرفت، ملازمت اور پھر ان معاملات کے نفاذ کے لیے قضا، تعزیرات وکفارات وغیرہ، اور پھر ان تمام ابواب کی حفاظت کے لیے آخر میں خلافت وامارت اور جہاد وسیاست کے ابواب لائے گئے ہیں، یہ سب کے سب مرتب شعبے بلاشبہ سیرتِ مقدسہ ہی کے ابواب ہیں، لیکن اس ترتیبِ نبوی اور اس کی متابعت میں ان ترتیباتِ نائبانِ نبوی سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی پیغمبرانہ سیرت کی اساس وبنیاد درحقیقت عقائد وعبادات ہی قرار دی گئی ہیں۔ خود حضور ﷺ نے بھی اسلام کی اساس وبنیاد عقائد وعبادات ہی کو قرار دیا جو دوسرے لفظوں میں سیرت کی بنیاد ہے، فرمایا:

"بني الإسلام علی خمس: شھادۃ أن لا إلہ إلا اللہ، وأن محمدًا رسول اللہ، وإقام الصلوۃ وإیتاء الزکوۃ، وصوم رمضان، وحجّ البیت إن استطاع إلیہ سبیلاً" (مشکوۃ)

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا، نماز کا قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے اور بیت اللہ کا حج اگر استطاعت ہو۔

جس سے نمایاں ہوتا ہے کہ سیرتِ نبوی میں عبادت اور دیانت اصل سیرت ہیں، اور انتظامی اور سیاسی ابواب اُس کے محافظ ہیں، جو بَعدیت کا درجہ رکھتے ہیں، تاکہ یہ بِر وتقویٰ اور یادِ خداوندی کا کارخانہ خلل اور زلل

سے محفوظ رہے اور دنیا میں کسی فتنہ پرور کو اس نظام سیرتِ نبوی میں رخنہ کی جرأت نہ ہو۔

قرآن کریم نے اس سے زیادہ کھلے لفظوں میں اقامت عبادت و دیانت کو اصل مقصود ٹھہراتے ہوئے تمکین وسیاست اور فتوح ممالک کو اُس کا وسیلہ قرار دیا ہے، فرمایا:{الذين إن مَكنّٰهم في الأرض أقاموا الصلوة وأتوا الزكوة وأمروا بالمعروف ونهوا عن المنكر}''اگر ہم ان (مسلمانوں) کو زمین کی سلطنت دے دیں، تو یہ نماز قائم کریں گے اور زکوۃ ادا کریں گے اور پاکیزہ امور کا امر کریں گے اور منکرات سے باز رکھیں گے۔'' (حج:۴۱)

یہی وجہ ہے کہ دین و دیانت تو تمام انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا لیکن قہر وسیاست اور جہاد و جنگ سب کو نہیں دی گئی، جہاں ضرورت سمجھی گئی دی گئی، ورنہ نہیں دی گئی، حضور ﷺ نے بھی اعلانِ نبوت کے ساتھ سب سے پہلے جو چیز دنیا کے سامنے پیش کی اور جس پر اپنے صحابہ کو تربیت دی وہ یہی ایمان باللہ، مبدأ، معاد، توحید و رسالت اور سزا و جزا کے عقیدے تھے اور پھر خدا سے رشتہ جوڑنے کے لیے عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ کی تعلیم فرمائی گئی جس سے مکی آیتیں بھری ہوئی ہیں۔

اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیرتِ مقدسہ کا اساسی اور غالب رنگ عبادت اور تقدس ہے اور وہ دنیا کے سارے معاملات کو اسی عباداتی رنگ میں دیکھنا چاہتی ہے، یعنی اس کا طبعی رُخ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اپنی ساری دنیا اور دنیا کے ایک ایک کام کو مقدس بن کر برنگِ عبادات انجام دیں، جن میں رضائے الٰہی اور یادِ خداوندی کی روح کارفرما ہو، وہ جو کچھ بھی کریں اللہ کے لیے کریں، نفسانی انداز اختیار کرنے کے بجائے ربانی راہ اختیار کریں، اور ان کا ہر عمل مجاہدہ و جہاد ہو، یعنی عبادت ہو عادت نہ ہو، جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہو اعلائے نفس نہ ہو، حق تعالیٰ نے یہی حقیقت جس کا نام تفویض ہے اپنے خلیلِ پاک حضرت ابراہیم علیہ السلام سے طلب فرمائی جسے اسلام کا نام دیا، فرمایا:

{قل إن صلوتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العٰلمين، لا شريك له وبذلك أمرتُ وأنا أول المسلمين}

''کہہ دو (ابراہیم) کہ میری نماز اور عبادت اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا امر کیا گیا ہے، اور میں ہی (اس امت میں) پہلا مسلم ہوں۔''

(الانعام: ۱۶۳، ۱۶۴)

یہی تفویض مطلق اور عبدیت کاملہ کی بلند پایہ کیفیت نبی کریم ﷺ کی سیرت تھی، جسے آپ نے اپنی دعا میں کھولا ہے، فرمایا:

"اللھم لک أسلمتُ وبک آمنتُ وعلیک توکّلتُ وبک حاکمتُ وإلیک خاصمتُ وإلیک أنبتُ وإلیک المصیر"۔

"اے اللہ! میں تیرے ہی لیے اسلام لایا اور تیرے ہی اوپر ایمان لایا اور تجھی پر میں نے توکل کیا اور تجھے ہی میں نے حکم مانا اور تیری ہی طرف میں ہر جھگڑا لے گیا اور تیری ہی طرف میں نے رجوع کیا اور تیری ہی طرف جانا ہے۔"

یہی حال جب اہل اللہ پر طاری ہوتا تھا تو تفویض کے عجیب وغریب عنوانات اُن کی زبانوں پر جاری ہوتے تھے، حضرت بابا فرید شکر گنج قدس سرہٗ پر یہ کیفیت غلبہ کے ساتھ وارد ہوئی تو وہ بار بار ذیل کی رباعی پڑھتے تھے اور سجدہ میں گر جاتے تھے، اور پھر اُٹھتے اور پھر وہی رباعی پڑھ کر پھر سجدہ میں جا پڑتے، جس کے راوی حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین دہلوی قدس سرہٗ ہیں، فرمایا:

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم
خاکے شوم وبہ زیر پائے تو زیمز
مقصود من بندہ ز کونین توئی
از بہر تو میرم و از برائے تو زیم

نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی اور سیرت کے بے شمار عملی نمونے اور اسوے ہمہ وقت جس روح سے زندہ و پائندہ تھے، وہ یہی ذکرِ الٰہی تفویض مطلق اور عبادتِ خداوندی کی روح تھی، گویا اسی کے لیے اس پاک زندگی کا لما چوڑا ڈھانچہ بنایا گیا کہ اس میں یہ ذکر وفکر کی رُوح پھونکی جائے، چناں چہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ ذکر اللہ سے معمور اور فکرِ آخرت سے بھرپور تھا، ذکر عام کے بارے میں حدیث ہے کہ: "کان یذکر اللہ علیٰ کل أحیانہ" آپ ہر لمحہ ذکرِ الٰہی میں لگے رہتے تھے۔ [ابن ماجہ: ص/ ۲۶] اور: "کان دائم الفکر حزیناً" آپ ہمیشہ متفکر اور غمزدہ سے رہتے تھے۔

پس آپ کی زندگی اور زندگی کی سیرت بالاصل نہ ملوکیت تھی نہ ریاست، نہ غلبہ وقہر تھی نہ تسلّط واستیلاء، نہ تعیّش تھی نہ تزیّن، نہ آرائش زیبائش تھی، نہ راحت طلبی وآسائش، بلکہ بندگی سرافگندگی، نیاز کیشی عبودیت اور

طاعت وعبادت تھی جس میں خوئے ذکر اور بوئے فکر سمائی ہوئی تھی، اور جو کچھ بھی زندگی نقل وحرکت تھی وہ اسی فکر اور ذکر دوامی کے رنگ میں تھی، قرآن نے اسی ذکر وفکر کے مجموعہ کو دانائی کہا اور اولوا الالباب یعنی عقلمندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

{الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکّرون في خلق السمٰوٰت والأرض}

"(دانشمند) وہ ہیں جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں کھڑے بیٹھتے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی ساخت اور بناوٹ میں۔" (النساء:۱۹۱)

پس قرآن کی رو سے محض مفکر بھی دانشمند نہیں جب کہ وہ ذاکر نہ ہو، اور محض ذاکر بھی پورا دانشمند نہیں جب کہ وہ مفکر اور متفکر نہ ہو، حقیقی دانشمندی وہی ہے جس میں ذکر بھی ہو اور فکر بھی، عقل بھی ہو اور عشق بھی، محبت بھی اور ہوش بھی، پس حضور ﷺ کی سیرت اسی ذکر وفکر کا مجموعہ اور ان دونوں مقاموں کا کامل امتزاج تھی، جہاں آپ کی عبادت ان دونوں روحوں کا مظہر تھی وہیں آپ کی سیاست بھی ان دونوں روحوں سے عبادت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، سرکارِ دوعالم ﷺ خلیفہ خداوندی بھی ہیں، معاملات کے فیصلے بھی دے رہے ہیں، دیوانی اور فوجداری کے مقدمات بھی فیصل فرمارہے ہیں، جہاد کے لیے لشکر بھی بھیج رہے ہیں، غنائم کی تقسیم بھی کررہے ہیں، حدود وقصاص کا اجراء بھی ہورہا ہے، فتوحاتِ ممالک کا سلسلہ بھی جاری ہے، صوبوں اور نئی حکومتوں میں گورنر بھی مقرر کیے جارہے ہیں، یہ سب کچھ ہورہا ہے، مگر صحنِ مسجد میں ذکر اللہ اور فکرِ آخرت کے ساتھ کیا جارہا ہے، یعنی یہ سب کچھ تھا مگر عبادتِ الٰہی کے ہی رنگ میں تھا، ڈھانچہ اگرچہ سیاست کا تھا مگر روح عبادت کی اُس میں کارفرما تھی، اور روح اور ڈھانچہ میں کامل مناسبت کے ساتھ ڈھانچہ اس روح کے حسبِ حال تھا اور روح ڈھانچہ کی مثال۔

پس آپ کی پیغمبرانہ سیرت کا امتیازی اور غالب پہلو یہی ایمان وعبادت اور ذکر وفکر تھا جس میں عقل وعشق، محبت وبصیرت، مادیت وملکیت، امارت ومسکنت، خلافت وعبادت کا کامل اجتماع وامتزاج تھا کہ ایک سے دوسری متقابل صفت کسی حالت میں بھی بے فکر نہیں بناسکتی تھی، حتی کہ آپ غزوات اور جنگوں میں بہ نفسِ نفیس خود بھی شرکت فرماتے اور نہ صرف شرکت بلکہ ان کی قیادت فرماتے، لیکن یادِ الٰہی اور رنگِ عبودیت سے یہ ہنگامہ خیزی بھی بھرپور رہ کر عبادت ہی کے رنگ میں ادا ہوتی تھی، عین جہاد میں بھی ذکر اللہ اور متعلقہ دعائیں پڑھتے ہوئے آپ لشکروں کی قیادت فرماتے، جس سے یہ جہاد اعلیٰ ترین عبادت بن جاتا، اور عین لڑائی میں جب کہ نماز کا وقت آتا تو یہ اضافی عبادت اس حقیقی عبادت میں حارج نہیں بن سکتی تھی، بلکہ اس کی مدت متعین ہوتی تھی:

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

جس سے نمایاں ہے کہ آپ کی پیغمبرانہ سیرت کا بنیادی پہلو ایمان و عبادت تھا، جس کے لیے دوسرے شعبہ ہائے زندگی بطور خادم اور بطور وسائل کے کام کرتے تھے، پس زندگی کے عام شعبوں کی عبادتیں وقتی تھیں اور یہ اصل عبادت ہمہ وقتی۔

اب اس سیرتِ جامعہ کا خلاصہ یہ نکل آیا کہ سیرتِ مقدسہ اصولاً زندگی کے تین شعبوں پر مبنی ہے، تعلق مع اللہ، تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس۔...... تعلق مع النفس کے سلسلے میں پاک دامنی و پاک نفسی عفت وعصمت، حیاء وانکسار، غیرت وحمیت، ہمت وشجاعت، صبر وسماحت، حلم وضبط، اعتماد وتوکل، زہد وقناعت، مجاہدہ وریاضت، تحمل شدائد ومصائب اور خدا ترسی وغیرہ کے اعلیٰ ترین ملکات اور اخلاقِ حمیدہ آپ کی فطرتِ صالحہ کا خمیر تھے۔

ادھر تعلق مع الخلق کے سلسلے میں خدمت خلق اللہ، صلہ رحمی، نصرت واعانت، جود وسخا، ایثار وعطا، راحت رسانی اور کفّ اذیٰ (ایذا رسانی سے بچنا) عفو ودرگزر، محبت وشفقت، دلسوزی وہمدردی، تعلیم وتربیت، ارشاد وتزکیہ وغیرہ آپ کی پاک طبیعت کے فطری جوہر تھے۔ اور تعلق مع اللہ کے سلسلے میں عبادت وریاضت، مجاہدہ ومراقبہ، کسرِ شہوات ولذات، تقرب وانابت، توبہ واستغفار، تہجد وشب بیداری، ذکر اور فکر وغیرہ آپ کی پاک فطرت کی افتاد تھی۔

لیکن ان تینوں تعلقات میں تعلق مع اللہ ہی دونوں تعلقات کی استواری کی روح تھی، جو نفس وخلق کے تعلقات کو صحیح نہج پر قائم کرتی ہے، اگر نفسِ انسانی کو تعلق مع اللہ سے آشنا اور اس کے تقاضوں کا خوگر نہ بنایا جائے، تو تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس صحیح بنیادوں پر کبھی قائم نہیں رہ سکتا، آج بھی جو لوگ اللہ سے منقطع ہو کر ان تعلقات کو خوشنما بنانے کی فکر میں ہیں وہ طرح طرح کی مہلک لغزشوں کا شکار اور نفسانی جذبات میں گرفتار ہیں، جن کی مہلک لغزشوں سے دنیا فتنہ وفساد کا گھرانہ بنی ہوئی ہے۔

آج یورپ میں عقل وفہم کی کمی نہیں، روابط اور بین الاقوامی علائق کی کمی نہیں، سیاسی تعلقات کی ہمہ گیری اور ان کی تدابیر کی کمی نہیں حتی کہ صرف انہی بین الاقوامی تعلقات کے لیے متحدہ کونسل یو، این، او (U.N.O) بھی قائم ہے، جس میں رات دن ممالک کے معاملات آتے رہتے ہیں، خانگی زندگی کے لیے تربیتوں کے بے انتہا ڈھنگ اور گھریلو زندگی کی خوشگواریوں کے لیے بے شمار لٹریچر وغیرہ سب ہی کچھ مہیا ہیں، لیکن اس کے باوجود انہی

کے اقراروں اوراعلانوں سے یہ ہی واضح ہے کہ گھر اور باہر سے چَین اور سُکھ مفقود ہے، یہی نفوس جن کی طمانینت کی خاطر یہ سب کچھ کیا جارہا ہے، امن واطمینان کی ہوا تک سے بھی کوسوں دور ہوتے چلے جارہے ہیں، اس کی وجہ فقدانِ اسباب نہیں کہ وہ تو سب مہیا ہیں، بلکہ مسبب الاسباب سے ربط کا فقدان ہے، خدا پرستی، خوفِ آخرت اور مالک الملک کے سامنے جواب دہی کا فکر معدوم ہے، اعتقاداً یا عملاً جوان تعلقات کو صحیح نہج پر نہیں آنے دیتا، جس سے ان نفوس می جذبہٴ انقیاد واتباعِ حق کے بجائے خودرائی اور خود بینی کے جراثیم پائے ہوئے ہیں، مدار کار غرورِ نفس ہے، یقینِ حق نہیں جس کے تحت خودغرضیوں اور قومی ونسلی اور وطنی تعصّبات کی آگ سلگ رہی ہے، اور اس سے تمدنی سیاسی اور اقتصادی اونچ نیچ کی مہلک وباسکون وامن کی جان لیوا بنی ہوئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا ان کے تمدنی وسائل اور ایجادات سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہے، لیکن دلوں میں ان سے تنفر کے جذبات بھی لیے ہوئے اور ان کی جبری قیادت کا جوا سروں اتار پھینکنا بھی چاہتی ہے، یہ محبوبیت کا فقدان اُسی خدا پرستی کے نہ ہونے اور خود پرستی کے ہونے سے رونما ہے، جس سے واضح ہے کہ کوئی بھی انسانی تعلق خواہ اپنے نفس سے ہو یا مخلوق سے بغیر خدائی تعلق کے ہموار رہنا ممکن نہیں، اسی لیے حضرت صاحبِ سیرت علیہ السلام نے اپنی سیرتِ مبارکہ کی روشنی میں بطور ضابطہٴ حیات ارشاد فرمایا کہ:

"من أصلح فیما بینه و بین الله أصلح الله فیما بینه و بین الخلق" الحدیث۔

''جس نے اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کا معاملہ درست کرلیا تو خدا اس کا اور مخلوق کے درمیان کا معاملہ خود درست فرمادیتا ہے۔'' (کنزالعمال: ۱۵/ ۷ ۳۳، رقم الحدیث: ۴۳۱۵۹، دارالکتب العلمیة بیروت)

اس لیے اگر آج ہم اس سیرتِ پاک کو اپنا کر اپنی زندگی کو صحیح بنیادوں پر اٹھانا چاہتے ہیں، تو اس میں سیرتِ مقدسہ کی روشنی میں ان تینوں تعلقات کو عملی صورت دیتے ہوئے ان کی روح اور بنیاد تعلق مع اللہ ہی بنانا ہوگا، جیسا کہ حضور ﷺ کی سیرتِ مقدسہ کا اساسی پہلو یہی تعلق ہے۔

اب اگر ہم سیرت عبادت واخلاق اور تعلق مع اللہ سے کنارہ کش ہوکر مثلاً محض قہر وسیاست اور اقتدار وغلبہ کی سیرت کو مطمحِ زندگی بنالیں، جس میں یہ اخلاقی روح نہ ہو تو یہ کوری سیاست ملک عضوض یعنی کٹکھنا ملک ہوکر رہ جائے گی ، جس میں کسی وقت بھی ظلم وستم، زبردستی اور زبردست آزادی سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہ جائے گی، اور اگر محض قومی خدمت اور رفاہیتِ عامہ کو مقصدِ زندگی ٹھہرالیں، جس میں خدا ترسی اور اخلاقی قدریں نہ ہوں، تو وہ کوری خودغرضی نمود ونمائش اور شہرت پسندی ہوکر رہ جائے گی، جس میں کسی وقت بھی قلبی یکسوئی اور مخلوق کی مدح

وذم سے بالاتر ہو کر غناء واستغناء کی دولت نصیب نہ ہو سکے گی، پھر اسی کے ساتھ اگر ہم تمام طبعی اور اجتماعی تعلقات سے الگ ہو کر محض عبادت اور خلوت گزینی اختیار کریں گے، تو نہ صرف ہم تعاونِ باہمی کی اُن تمام قوتوں سے محروم ہو جائیں گے، جو مدنیت کی روح اور اجتماعیت کی اساس ہیں، اور جن کے بغیر وہ عالمگیر خدمت انجام نہیں پاسکتی، جو سیرتِ پاک اور طبیعتِ اسلام کے تقاضے ہیں، بلکہ اس قیدِ تنہائی میں گلہ سے الگ ہو کر کسی وقت بھی نفس وشیطان کی مکاریوں سے پناہ نہیں پاسکیں گے، جنہوں نے خلوت گزیں راہوں کو کتنی ہی بدکاریوں کا شکار بنایا ہے۔

پس خدمتِ خلق بلا عبادت انانیت ہے، خدمتِ نفس بلا خدا ترسی نفسانیت ہے، انقطاعی عبادت بلا خدمتِ خلق رہبانیت ہے، اور ریاست بلا عبادت ملوکیت واستبدادیت ہے، اور ظاہر ہے کہ نہ رہبانیت حضور ﷺ کی سیرت ہے نہ ملوکیت، نہ نفسانیت آپ کی سیرت ہے نہ انانیت، کیوں کہ یہ اکہری چیزیں الگ رہ کر جیسے مجموعی سیرت نہیں بن سکتی، ایسے ہی اپنی روح سے الگ ہو کر اس روح کے خلاف خود رو نقشوں اور رسوم کے ساتھ اجزاء سیرت بھی نہیں کہلائی جاسکتیں کہ انہیں جزوی سیرت ہی کہا جاسکے، البتہ جب اس خدمتِ خلق اور خدمتِ نفس کے خانوں میں اخلاق وعبادت کا رنگ بھر دیا جائے اور یہ سب اجزاء اپنے مطلوبہ نقشوں کے ساتھ عبادت کے محور پر جمع ہو جائیں، تو پھر اُس جامع سیرت کا عکس پیدا ہو جائے گا جس کا نام لے کر ہم اُس کا کام کرنا چاہتے ہیں، اب اُسے نہ نفسانیت کہیں گے نہ رہبانیت، نہ ملوکیت کہیں گے نہ انانیت، بلکہ ربانیت کہیں گے، جس میں انسان اپنی ہر نقل وحرکت کا مرجع ومحور اپنے رب کو بنالے گا، پس ان تمام اجزاء کی پاک اور مطلوب صورتوں کا صحیح اور معقول امتزاج ہی سرکار دو عالم ﷺ کی جامع ترین سیرت ہے، جس میں فرد کی رعایت الگ ہے اور قوم کی الگ، حکومت کی رعایت الگ ہے اور رعایا کی الگ، اُس میں دیانت بھی ہے اور سیاست بھی، انفرادیت بھی ہے اور اجتماعیت بھی، خدمت بھی ہے اور غنائیت بھی، اور ان سب عناصر کے امتزاج س سیرتِ صالحہ کا حاصل یہ نکل آتا ہے کہ انسان میں طبعی جذبات باقی رہیں گے، مگر اُن پر عقل کی حکومت ہو، عقلی نظریات بھی ہوں، مگر اُن پر وحیٔ الٰہی کی نگرانی ہو، آزادیٔ ضمیری بھی ہو، مگر اُس میں حق کے ساتھ تقید ہو، غرض، نفس، طبع، عقل، وجدان، ضمیر اور جذبات میں سے کوئی چیز بھی پامال نہ ہو، سب کے تقاضے کارفرما رہیں، مگر ہر ایک کی نقل وحرکت کا محور طاعتِ الٰہی اور ذکرِ خداوندی ہو اور کسی وقت بھی یہ تقاضے پابندیٔ حق سے آزاد نہ ہوں، بس اسی جامعیت اور اعتدالِ کامل کا نام سیرتِ مقدسہ حضرت خاتم الانبیاء ﷺ ہے۔

آج اگر ہم اپنے نونہالوں کے لیے سچے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ نہایت اونچے پیمانہ

کے دیندار اور خدا پرست ہوں جن میں بے راہ روی، بے قیدی، بداعتقادی اور اصول سے آزادی نہ ہو، اُن کی نگاہ خدا پر ہو، اور اُسی پر بھروسہ اور اعتماد رکھتے ہوں، اور دوسری طرف وہ ملک کے سچے شہری اور متمدن ہوں جن کے حالات ومعاملات میں دیانت، صداقت، راست گوئی اور راست بازی ہو، شخصی مفاد کے غلبہ کے بجائے قومی اور جماعتی مفاد اُن پر غالب ہو، ایک طرف وہ مساجد ومدارس کی زینت ہوں اور دوسری طرف درباروں اور بازاروں کا نظم بھی ان کے ہاتھوں فروغ پا رہا ہو، ایک طرف اُن کی خلوت گاہیں یادِ الٰہی سے بھرپور ہوں اور دوسری طرف ان کی جلوتیں اور حکومت کے دفاتر اُن کی عدل گستری سے معمور ہوں، ایک طرف وہ اپنے ملک میں خوشحال اور خوش مآل ہوں اور دوسری طرف دوسرے ملک ان کی طرف رجوع لاکر نہ صرف ان سے عزت مندانہ تعلقات ومعاملات ہی کو اپنی آبرو سمجھیں، بلکہ اُن کے مثالی معاملات سے درس بھی لیں، تو یہ جامع زندگی بجز اس سیرتِ جامعہ کی عملی پیروی کے اور کہیں بھی انہیں دستیاب نہیں ہوسکتی۔

نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پیشتر انسانوں کی یہ دنیا دین کے نام سے تو رہبانیت اور انقطاع کا شکار تھی، ترکِ لذات اور ترکِ مرغوبات ہی اصل دین بن گیا تھا، تعذیبِ جسمانی ہی کا نام تہذیبِ روحانی رکھ لیا گیا تھا، اور اس قسم کے لوگ ساری دنیا سے الگ تھلگ ہوکر پہاڑوں کی کھوہ اور درّوں میں چھپے ہوئے پڑے تھے، نہ وہ دنیا کے کارآمد تھے نہ دنیا ان کے کام کی تھی، جن کو حدیث نبوی میں **"فتلک بقایاھم فی الصوامع والدیار"** سے متعارف کرایا گیا ہے، اور دوسری طرف ان پہلوؤں کے بالکل برخلاف متضاد کنارہ پر نظم ملک اور تمدن کے نام سے نفس پروری زیانیت اور نفس پرستی کا ثبوت دیا جا رہا تھا، جس کا محور اُس دور میں دو ہی زبردست طاقتیں تھیں، ایک طرف فارس میں کسریٰ کی حکمرانی تھی جو مشرقی ممالک پر اثر انداز تھی، اور دوسری طرف روم میں قیصر کی جہانبانی تھی جو مغربی ریاستوں پر چھائی ہوئی تھی اور اس طرح دنیا کی تمام چھوٹی بڑی حکومتیں اِنہیں دو گروپوں میں بٹی ہوئی تھیں، ان دونوں حکومتوں کی سیاست، ملوکیت اور استبدادِ خالص کی گود میں پرورش پاکر انسانوں کی گردنوں پر مسلط تھی، یہ ملک حاکم ومحکوم کے دو طبقوں میں بٹ کر اپنی سالمیت کھو چکے تھے، آقائی وغلامی کے دو طبقے بنے ہوئے تھے، اس لیے راعی ورعایا میں محض جبری علاقہ رہ گیا تھا، رعایا اپنے حکمرانوں سے تنگ اور ان پر لعنت بھیجتی تھی اور راعی یا حکمران طبقہ رعایا کو بہائم کا درجہ دیئے ہوئے تھا، جن کی محنت سے دولت سمیٹتے رہنا ہی اُس کا سب سے بڑا کام رہ گیا تھا، بظاہر رابطہ اور بحقیقت نفرتِ باہمی کے جراثیم راعی ورعایا میں پرورش پا رہے تھے، ملک بظاہر کرّ وفر سے آراستہ تھے، مگر اندرونی طور پر باہمی بے اعتمادی کی بھٹی بنے ہوئی تھی، دولت غیر

متوازن ہوکر اُمراء کے چند خاندانوں میں سمٹ آئی تھی، ایک ایک امیر ونواب کے بدن پر جب تک ایک ایک لاکھ روپیہ کی مالیت کا لباس، سونے کے تاج سروں پر اور جواہرات کے مرصّع پٹکے زیبِ کمر نہ ہوتے تو وہ سوسائٹی میں آنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا، اورعوام کی آبرو صرف بھوکے ننگے رہ کر خواص کی فرمانبرداری کو مانتے رہنا قرار پا چکی تھی، غرض پورا ملک سیاسی اقتصادی اور طبقاتی اونچ نیچ اور باہمی بے اعتمادی کا جہنم بنا ہوا تھا۔

دنیا والے دنیا کے نام پر انہی دو متضاد کناروں پر تھے کہ قدرت نے اُن کے دلوں کی فریاد سُنی اور اس افراط وتفریط کے عذابِ الیم سے چھڑانے کے لیے عدل ومساوات کا آفتاب جہاں تاب چمکایا، یعنی فاران کی چوٹیوں سے حضرت خاتم الانبیاء ﷺ اپنی کامل الاعتدال عدل ومساوات سے پُر، اخوتِ باہمی اور اعتماد مابینی کی پاکیزہ ترین تعلیم اور سیرت لے کر دنیا میں نمودار ہوئے، آپ نے ایک طرف رہبانیت کو للکارا اور ایک طرف اس ملوکیت کو چیلنج کیا، رہبانیت کے بجائے ربانیت پیش کی، اور ملوکیت کے بجائے خلافت کا آوازہ لگایا، دین اور دنیا کی تفریق مٹا کر دونوں کا سنگم بتایا، پہاڑوں اور غاروں کی انقطاعی عبادت کے بجائے مساجد اور کھلی زمین کی جلوہ گاہوں میں اجتماعی عبادت کا راستہ دکھایا، حاکم ومحکوم کا فرق مٹا کر قومی خدمت کا پرداز ڈالا، اور سید القوم خادمہم کا پاکیزہ اصول پیش کیا، راعی ورعایا میں اخوت کا تعلق قائم فرمایا، معاشرت اور مدنیت کو مساوات کے اصول پر قائم جو بندے خدائی مسند لینا چاہتے تھے انہیں آسمانوں سے زمین پر اتارا، اور جن کو بندگی سنبھالنا بھی بھاری ہو رہا تھا انہیں سہارا دے کر زمین سے اوپر اٹھایا جس سے اونچ نیچ مٹ کر توازن قائم ہوا اور یہ دونوں متضاد طبقے ایک دوسرے سے قریب ہوئے جس سے رہبانیت بھی دم توڑ کر رہ گئی اور ملوکیت پر بھی زندگی کی راہیں تنگ ہوگئیں، انسان کا کمال اوصافِ حق سے آراستہ ہوکر خلیفۂ خداوندی بن جانا سب نے محسوس کرلیا اور اس کا سب سے بڑا عیب خدا سے کٹ کر اپنے نفس کی پوجا کرنا شمار کیا گیا، غرض سیرتِ مقدسہ کے عدل ومساوات اور اجتماعیت نے بڑھ کر رہبانیت وملوکیت پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ قیصریت وکسریت کے بُت اوندھے ہوگئے اور دیانت وسیاست کی آمیزش سے ایک طرف خلافتِ خداوندی انسانوں میں نمایاں ہوئی اور دوسری طرف دیانت اجتماعی کے جوہر پیدا ہوئے اور دونوں میں توحید وعدل کا رنگ صاف نمایاں ہوگیا، توحید نے لاکھوں انسانوں کی کثرتوں کو ایک کرکے اُن میں جماعتی عبادت کا جذبہ پیدا کیا اور عدول ومساوات نے اونچ نیچ میں پڑے ہوئے بے اعتماد انسانوں میں اعتماد باہمی اور مابینی خدمت وتعاون کے جذبات پیدا کردیئے جس سے اُن میں یکسانی آگئی اور اس طرح پہاڑوں میں پڑے ہوئے رہبان تو منظرِ عام کی عبادت گاہوں میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوگئے اور عرشِ حکومت

پر بیٹھے ہوئے ملوک فرشِ خاک پر اُتر کر عوام کے ساتھ آ ملے، ادھر جو لوگ استبداد پسندوں کی غلامی میں پڑے ہوئے دم توڑ رہے تھے، اُن میں حوصلے پیدا ہوئے اور وہ اس آزادی وحریت کی چمک دمک دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور خود اپنے ہاتھوں سے غلامی کی زنجیریں توڑ کر میدانِ مساوات میں آ گئے، اور جو لوگ تمدن کی ظاہری چمک دمک پر فریفتہ رہ کر خالق کے سامنے سرِ عبودیت جھکانے کا وقت ہی نہیں پاتے تھے وہ اپنی دنیا کے جھرمٹ میں رہ کر بھی دین سے محروم نہ رہے، غرض اس سیرتِ مقدسہ نے مرتی ہوئی دنیا کو سنبھال لیا اور مادیت وروحانیت اور دیانت وسیاست کے صحیح امتزاج سے ایک ایسی مخلوط اور معتدل راہ دکھائی کہ ہر ایک اپنے دائرہ میں رہ کر دین اور دنیا دونوں سے منتفع ہونے کے قابل بن گیا۔

آج تیرہ سو برس کے بعد دنیا کا نقشہ پھر وہی بن گیا ہے جو تیرہ صدی پیشتر بنا ہوا تھا، آج بھی مشرق ومغرب کی دنیا دو ہی گروپوں میں بٹی ہوئی ہے، ایک طرف امریکن گروپ ہے جو مغرب پر اثر انداز ہے اور دوسری طرف ''رشین'' گروپ ہے جو مشرق پر اثرات قائم کیے ہوئے ہے، آج دنیا کی ہر چھوٹی بڑی ریاست انہی دو گروپوں میں سے کسی ایک کے ماتحت یا زیرِ اثر رہنے پر مجبور ہے، اور پوری دنیا دو جہتوں میں بٹ کر رہ گئی ہے، وہی ملوکیت، وہی اقتدار پرستی، وہی اونچ نیچ اور وہی آقائی اور غلامی کے جراثیم مثل سابق پل پل کر شباب پر آئے ہوئے ہیں، قیصریت نے امریکیت کا چولا پہن رکھا ہے اور کسرویت نے رشیائیت کا لباس زیبِ تن کیا ہوا ہے، فرق اگر ہے تو صرف یہ پہلے شخصی اقتدار بلا واسطہ کارفرما ہوتا تھا، اب وہ عوام کی آڑ میں کام کرتا ہے، پہلے اُس کا نام شخصیت تھا اب جمہوریت ہے، بہر حال جو نقشہ فارس وروم کا تھا وہی اب امریکہ وروس کا ہے، فرق صرف شخصیت وعوامیت کے عنوان کا ہے ؎

وہی فتنہ ہے لیکن یاں
ذرا سانچہ میں ڈھلتا
ہے

لیکن جس سیرتِ مقدسہ نے اُس وقت کی قیصریت وکسرویت کا زور توڑا تھا وہ آج کی قیصریت وکسرویت کا بھی صحیح علاج کر سکتی ہے، اور جس سیرت کی ہمہ گیر معنویت سے اُس وقت کے دو عالمگیر گروپوں کی قوت ٹوٹی تھی وہی آج بھی اس گروپ بندی کا نقشہ بدل سکتی ہے، اور وہ صرف نبی کریم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ ہے، جس میں نہ شخصیت ہے نہ رسمی جمہوریت، نہ رہبانیت ہے نہ عوامیت، نہ کوری سیاست، خشک دیانت، بلکہ اصل

خلافت ہے، خواہ وہ شخصیت کے پردہ میں کام کرے یا جماعت کے، اصل دیانت ہے، خواہ وہ سیاست کے چولے میں نمودار ہو یا عبادت کے بھیس میں اصل توجہ الی اللہ اور خوفِ آخرت ہے، خواہ وہ تدین کے روپ میں نمایاں ہو یا تمدن کے لباس میں، غرض ان دونوں سے بالاتر ہو کر سیرتِ نبوی نے وہ ہمہ گیر اصول پیش کر دیا، جس کے وسیع دائرہ میں دین و دنیا، دیانت و سیاست، انفرادیت و اجتماعیت سب باقی بھی رہیں، اور اُن کے اصل جوہر کارآمد بھی ہو گئے، اور پھر ان دونوں متضاد کناروں کو اس ہمہ گیر اصول میں جوڑ کر اُن کی آمیزش سے ایک ایسا جامع رنگ لا رکھا، جس سے اب تک دینا نا آشنا تھی، آج کی ناہموار دنیا ہمواری کی تلاش میں ہے، اور آج کے جدید تمدن کے پجاری خود اپنے تمدن کی مبالغہ آرائیوں سے تنگ آ چکے ہیں، انہیں خود ایک معتدل مسلک کی تلاش ہے، وہ آج کی مدنیت کے انتہا پسندانہ جذبات سے عاجز آ کر خود ہی دوسرا راستہ مانگ رہے ہیں، اور اس تمدن کی کشمکش اور بے سکونی و بے اطمینانی سے پریشان ہو کر سکونِ دل کی تلاش میں ہیں، جو تمدن کو چھوڑے بغیر اور رہبانیت اختیار کیے بغیر انہیں مل جائے، تو کیا یہ جامع راستہ انہیں بجز اسی سیرتِ مقدسہ کے کہیں اور دستیاب ہو سکتا ہے؟ کبھی نہیں؛ یہود و نصاریٰ سے تو یوں نہیں کہ وہ خود ہی ایک متلاشی کی حیثیت سے سرگرداں ہیں اور پھر اُن کے سوا کسی اور قوم سے یوں نہیں کہ اور سب قومیں ان ہی متمدنوں کی نقالی اور پیروی کو آج اپنی بقا و ارتقاء کا راستہ سمجھ رہی ہیں، اس لیے یہ ذمہ داری اسی قوم کی ہو سکتی ہے ج کا نام اس سیرت کی پیروی سے مسلم ہوا تھا اور جس طرح اس قوم نے اس ذمہ داری کو تیرہ صدی پیشتر پورا کیا تھا آج بھی وہی پورا کر سکتی ہے، ہاں اگر یہ قوم اپنی ذمہ داری ہی محسوس نہ کرے، تو جس خدا نے ذمہ داری نباہنے پر اس قوم کے لیے اپنا وعدہ استخلاف پورا کیا تھا اور اس قوم کو زمین کی سلطنت عطا کی تھی جیسا کہ آیتِ استخلاف میں ارشاد ہے:

{وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم و عملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنّھم في الأرض}۔ (النور: ۵۵)

''اللہ نے وعدہ کیا ہے ان سے جو ایمان لائے اور عملِ صالح اختیار کیا کہ انہیں زمین میں خلافت دے (اور سلطنت عطا فرمائے گا)''

وہی خدا اس ذمہ داری کو محسوس نہ کرنے پر وعیدِ استبدال بھی پوری کر سکتا ہے کہ اس قوم سے زمین کی سلطنت چھین کر دوسری قوموں کے حوالے کر دے جیسا کہ آیتِ استبدال میں ارشاد ہے:

{و إن تتولوا یستبدل قوماً غیر کم ثم لا یکونوا أمثالکم}

''اور اگر تم (اس دین کی خدمت سے) پھر جاؤ گے تو تمہاری جگہ دوسری قوم بدل کر لے آئے گا اور وہ تم

جیسے (سُست اور کاہل) نہ ہوں گے۔'' (محمد: ۳۸)

پس جیسے استخلاف کا وعدہ اپنے وقت پر پورا کر دیا گیا ایسے ہی استبدال کی وعید بھی اپنے وقت میں برسرِ کار آسکتی ہے، پس آج ضرورت ہے کہ مسلم قوم اٹھے اور سیرتِ مقدسہ کو پریشان دنیا کے سامنے پیش کرے، مگر نہ اس طرح کے سیرتِ مقدسہ ایک نعرہ ہوکر رہ جائے بلکہ اسوہ اور نمونہ عمل کے لباس میں سامنے آئے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ ایسی شخصیتیں اس کام کو آگے پڑھائیں جو اس سیرت سے ہم آہنگ ہوں، یعنی سیرت کی ترویج محض لٹریچر محض پروپیگنڈہ اور محض کانفرنسوں سے نہیں، بلکہ صحیح لٹریچر کے ساتھ، صحیح شخصیتوں اور ایسے عملی نمونوں سے ہوسکتی ہے جو تقشّف اور زہد خشک سے بھی بالا ہوں، اور فکری بے قیدیوں اور آزاد روشی سے بھی بری ہوں، کیوں کہ جہاں قوم کی اجتماعیت کو ایسے افراد سے نقصان پہنچ رہا ہے جو تقشّف کی راہ سے جمودِ محض اور رہبانیت کو سیرت سمجھے ہوئے ہیں، وہیں ایسے طبقات سے بھی مضرت پہنچ رہی ہے ج آزادیٔ ضمیر اور حریتِ فکر کے نام پر دین میں طبع آزمائیوں اور تخیل آفرینیوں سے راہ بنانے کا نام سیرت رکھے ہوئے ہیں، اگر پہلے طبقہ کے نزدیک آیات وروایات اور سلف کے اقوال ومقالات میں محدود رہنے کے معنی ہر فکری قوت کو زائل کردینے اور ہر عبرت وبصیرت سے کنارہ کش ہوجانے کے ہیں، تو دوسرے طبقہ کے نزدیک ان روایاتِ سلف کے تمام مقالات اور ان قائم کردہ حدود کو توڑ دینے کا نام استنباطِ فکر اور حریتِ رائے کے ہیں، لیکن یہ دونوں چیزیں سیرت سے تعلق نہیں رکھتیں، جمود کے طریقہ کو قرآن حکیم نے دعوتِ فکر دے کر آیتِ ذیل سے ردّ کردیا ہے کہ: {ولیذّکر أولوا الألباب} ''اور چاہیے کہ تذکر کریں دانشمند'' (الحجر: ۵۲)

اور فرمایا: {لم یخرُّوا علیها صُمًّا وعُمیاناً} ''(آیاتِ الٰہیہ کی یاددہانی پر) وہ بہرے اور اندھے ہوکر نہیں گرتے (بلکہ فکر وبصیرت سے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں)۔'' (الفرقان: ۷۳)

اور آزادیٔ نفس کے طریقہ کو قرآن حکیم نے آیتِ ذیل سے مردود قرار دیا ہے: {ثم جعلناک علی شریعة من الأمر فاتّبعها ولا تتبع أهواء الذین لا یعلمون} ''پھر ہم نے آپ کو قانونِ شریعت پر قائم کیا ہے، تو اسی کا اتباع کیجیے اور جاہلوں کی اہواء (تخیل آفرینی) کی پیروی نہ کیجیے۔'' (الجاثیۃ: ۱۸)

پس یہ دونوں راستے سیرت کی اقلیم تک پہنچانے والے نہیں، جس سے صاف واضح ہے کہ سیرت کا ایک رکن اگر تقیدِ کامل ہے تو دوسرا رکن اصولِ حقہ کی روشنی میں تدبرِ کامل بھی ہے، چناں چہ تقیدِ کامل کے بارے میں تو تمام انبیاء علیہم السلام اور خصوص نبی کریم ﷺ کی واضح سیرت قرآن نے یہ بیان کی کہ: {ما کنتُ بِدعاً من الرسل وما

ادري ما یُفعلُ بي و لا بکم، إن اتبع إلا ما یو حٰی إليَّ، و ما أنا إلا نذیرٌ مبین} ”میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا، میں تو اپنی طرف آئی ہوئی وحی کے سوا کسی چیز کا اتباع نہیں کروں گا، میں سوائے اس کے کہ ایک کھلا ڈرانے والا ہوں اور کچھ نہیں۔“ (الاحقاف:۹)

اور آیاتِ الٰہیہ کی روشنی میں فکر و بصیرت کی آزادی کے بارے میں سیرتِ پاک یہ بیان کی ہے:{قل هذه سبیلی ادعو إلی الله، علی بصیرۃٍ أنا و من اتبعني} ”فرما دیجیے کہ یہ ہے میرا راستہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور میرے ماننے والے بصیرت پر ہیں۔“ (یوسف:۱۰۸)

بہر حال اپنی اپنی حدود میں پابندیٔ کامل اور آزادیٔ کامل کے کامل امتزاج کا نام سیرت ہے جس سے یہ واضح ہے کہ دین میں آزادی کے معنی اصول کے اندر آزادی کے ہیں، اصول سے آزاد ہو جانے کے نہیں، اور دین میں پابندی کے معنی منقول پروگرام کی پابندی کے ہیں، خیالی یا رواجی پروگرام کی پابندی کے نہیں، اس لیے بے بصیرت متقشف بھی سیرت کی راہ نہیں چل سکتا اور اصول سے آزاد مفکر بھی اس سیرت کی راہ نہیں پا سکتا، سیرت اِن دونوں راستوں کے بیچ میں ہے جس میں پابندی اور آزادی، حریت اور عبدیت، فکر اور اتباع، استنباط اور ادب، قانون اور اخلاق، عقل اور عشق، ذکر اور فکر، تعلق مع اللہ اور تعلق مع الخلق دونوں اپنی اپنی جگہ پر ہوں، نہ پابند بے حریت سیرت پر ہوگا، نہ آزاد بے عبدیت، نہ مفکر بے اتباع سیرت سے مربوط ہوگا، نہ مجتہد بے ادب، نہ مقنن بد خلق سیرت سے متعلق رہ سکتا ہے، نہ خلیق الا قانون، نہ عاقل بے عشق سیرت پا سکتا ہے، نہ عاشق بے عقل، نہ ذاکر بے بصر اصل سیرت پر ہے، نہ مبصر بے ذکر، نہ دیانت بے خدمت سیرت ہے، نہ خدمت بے دیانت، بلکہ دونوں کی معتدل آمیزش سے جو جامع اسوہ بنے گا وہی سیرتِ مقدسہ ہے۔

پس اس جامع سیرت میں جہاں گلیم پوشی ہے وہیں عالمی حکمرانی بھی، جہاں شاہی ہے وہیں درویشی بھی ہے، جہاں ”أنا النبي لا کذب“ کا نعرۂ جلال ہے وہیں ”لا تقولو أنا خیر من یونس ابن متی“ کا نعرۂ جمال بھی ہے، وہاں جس طرح ایک ہاتھ میں خدا کی روشن کتاب ہے وہیں دوسرے ہاتھ میں اعلاء کلمۃ اللہ کی چمکتی ہوئی تلوار بھی ہے، وہاں جس طرح بغض فی اللہ کے تحت ”اللہ اکبر“ کا رجز ہے وہیں حب فی اللہ کے تحت مکہ کو ”انت احب البلاد الی اللہ“ کا خطاب بھی ہے، وہاں جس طرح خانگی زندگی میں ”کلمیني یا حُمیرا کلّمي“ کے محبت آمیز مخاطبات ہیں، وہیں بین الاقوامی زندگی میں سلاطینِ عالم کو فرامینِ نبوت کے ذریعہ خطاب بھی کیا جا رہا ہے، غرض ”انا الضحوک“ اور ”انا القتال“ کے نعرے بیک وقت جمع ہیں اور شدت و رحمت ساتھ ساتھ چل رہی ہیں، اللہ

کی طرف سے اپنے رسول کو یہ بھی حکم ہے کہ {فبما رحمة من اللہ لنتَ لھم} [آل عمران: ۱۵۹] اور یہ بھی امر ہے کہ {جاھد الکفار و المنٰفقین و اغلُظ علیھم} [التوبة: ۷۳]، نہ شدت میں رحمت مانع ہے نہ رحمت میں شدت، نہ جہاد میں مجاہدۂ نفس حارج ہے نہ مجاہدہ میں جہاد، قاہرانہ اور مشفقانہ دونوں شانیں جمع ہیں، یہ ارشاد ہے کہ "أنا سیدوُلد آدم" اور سچا ارشاد ہے، اور یہ بھی ارشاد ہے کہ "اللھم احینی مسیکناً و أمتنی مسکیناً" اور بجا ارشاد ہے، جلو میں عبد الرحمن بن عوف، جابر بن عبد اللہ اور عثمان غنی جیسے اغنیاء صحابہ بھی اور ابوذر غفاری، مقداد، عمار بن یاسر اور ابو ہریرہ جیسے فقراء صحابہ بھی ہیں، حضرت عمر اور خالد جیسے تلوار کے دھنی اور شجاعانِ عرب بھی قدموں سے لگے ہوئے ہیں، اور زید بن ثابت اور حسان بن ثابت جیسے قلم کے دھنی بھی وابستۂ دامن ہیں، اور سب کے ساتھ اور صدیق اکبر جیسے جامع صفات صحابی بھی، جو ایک امت واحدہ ہیں، تابعِ فرمان ہیں، اور ان سب پر رحمتِ نبوت کی کرنیں یکسانی کے ساتھ پڑ رہی ہیں، لیکن نہ اغینا ء کو فقیر ہو جانے کی ہدایت ہے نہ فقراء کو اغنیاء بن جانے کا امر ہے، نہ اربابِ سیف کو قلم سنبھالنے کی ہدایت ہے، نہ اربابِ قلم کو تلوار پر مجبور کیا جا رہا ہے، بلکہ سب طبقے اپنے اپنے حال میں مست رہ کر انہی متفاوت احوال سے بارگاہِ حق میں واصل ہو رہے ہیں ؂

یوں بہم کس نے کیے

ساغر وسنداں دونوں

اسی جامع سیرت پر آپ نے اپنی امت کو تربیت دی اور یہی جامعیت واعتدال امت سے ہمہ وقت مطلوب بھی ہے، جو اس سیرت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس سیرت سے اُس وقت کی مضطرب دنیا کو امن وچین ملا تھا اور اسی سیرت سے آج کی دنیا کو بھی راہ دکھانے کا راستہ مطلوب ہے۔

پس آج دولت وعزت، وجاہت حکومت سب کچھ مل سکتی ہے، لیکن اس سیرت میں اسے رنگے بغیر وہ مقبولیت پیدا نہیں کر سکتی۔

اس مختصر تحریر کا موضوع سیرت کے ابواب پر کلام کرنا یا اُس کی تفصیلات بیان کرنا نہ تھا، جب کہ یہ کسی ایک تحریر میں ممکن بھی نہ تھا، جو سیرت قرآن میں بصورتِ متن، حدیث میں بصورتِ شرح، فقہ میں بصورتِ مسائل، اصولِ فقہ میں بصورتِ دلائل اور علماء کی بے شمار تصانیف میں بصورتِ اجزاء وتفاصیل موجود ہے اُسے کسی تحریر میں کس کا یارا ہے کہ سما کر پیش کرے اور سارے قرآن وحدیث اور فقہ واصولِ فقہ کا عطر کھینچ کر ایک کاغذ پر

رکھ دے، نہ یہ ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت ہی ہے، پس اس تحریر کا موضوع سیرت کا پیش کرنا نہیں بلکہ سیرت کی جامعیت کے چند بنیادی اصول بیان کر کے سیرت کی نشان دہی کرنا تھا تا کہ اس عظیم بین الاقوامی کانفرنس میں اس کی نوعیت کا فی الجملہ تعارف کرایا جا سکے، اگر ہمارے عوام اور ہمارے خواص ہماری قومیں اور ہماری اسلامی حکومتیں اپنے نظامِ اجتماعی کا آخری نقطہ اور نصب العین کا جزو اخیر اس نشان دادہ جامع سیرت اور اس کی تمرین وترویج کو بنالیں جس کی آج دنیا متلاشی ہے، تو وہ بلا شبہ عالمی امن قائم کرنے میں ایک بڑا رول ادا کریں گی، پوری دنیا کی محسن ثابت ہوں گی اور تاریخ کے صفحات میں ان کا نام اور یہ کام سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ وباللہ التوفیق!

(نقوش رسول ﷺ: ص/ ۳۸ تا ۵۱)

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

مقامِ خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم (جدت پسندی سے متأثر ہیں بلکہ مؤید وداعی گذرے ہیں البتہ مضمون سے ایسے مخدوش مواد کو حذف کیا گیا ہے پھر بھی اگر کوئی بات ہو تو نشاندہی کی گذارش ہے) فرماتے ہیں:

دنیا کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ یہ بھی ہے:

۱- دنیا کے تمام بڑے مذاہب اور تمام بڑے فلسفے (مدارسِ فکر) ساتویں صدی قبل مسیح سے لے کر چھٹی صدی عیسوی کے آخر تک پیدا ہو گئے، اور جب یہ تمام فلسفے اور مذاہب 700 B.C.to 600 A.C پیدا ہو چکے، تو ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں یعنی 610 A.C میں ایک نبی امی ﷺ نے قرآن پیش کر کے ساری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا اور......

۲- ساری دنیا کو چیلنج بھی کر دیا۔

۳- ساری دنیا میں ایک حیرت انگیز اور اس کے ساتھ سب سے بڑا مذہبی، ذہنی اور سیاسی انقلاب بھی برپا کر دیا۔

۴- بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر دیا تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔

۵- خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس نبیٔ اُمی ﷺ نے ۲۳ رسال کی مختصر مدت میں نئی زمین پیدا کردی، نیا آسمان پیدا کردیا، اورانسانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کردی جن کو صحابہ کرام کہتے ہیں، جو دن کو گھوڑوں پر سوار ہوکر جہاد کرتے تھے، اور رات میں اپنے آنسوؤں سے زمین کو سیراب کرتے تھے، اور اپنے سجدوں سے زمین کو رشک افلاک بناتے تھے، جن کی تسبیح وتہلیل پر فرشتوں کو رشک آتا تھا، اور جن کی شانِ عفت پر حوریں رشک کرتی تھیں، اور جن کے غضِ بصر پر حمص کی عیسائی عورتوں نے جو انہیں دیکھنے کے لیے بن سنور کر بالا خانوں میں بیٹھی ہوئی تھیں، بے اختیار یہ کہا تھا کہ ''یہ مسلمان انسان نہیں ہیں، فرشتے ہیں'' اس لیے کہ ان کے سپہ سالار امین الامۃ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے ان کو ہدایت کردی تھی کہ تمہارے دیدارِ فرحت آثار سے اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کے لیے یہودی اور عیسائی عورتیں سولہ سنگھار کے ساتھ نکلی ہیں، اس لیے تم اپنی نگاہیں نیچی رکھنا، کسی عورت کی طرف مت دیکھنا۔

یہ بات بھی لائقِ توجہ اور قابلِ غور ہے کہ بعثتِ نبوی ﷺ یا نزولِ قرآن کے بعد سے آج تک نہ تو دنیا میں کوئی نیا مذہب پیدا ہوا ہے، نہ نیا مدرسۂ فکر (School of Philosophy)، بظاہر نئے فلسفے قدیم فلسفوں کی جدید تعبیرات ہیں، اگر وقت ہوتا یا مجھ میں دماغی طاقت ہوتی، تو میں دو تین گھنٹے میں اس دعوے کو مبرہن کردیتا، تاہم اربابِ علم کے تفننِ طبع کے لیے صرف تین مثالیں دیئے دیتا ہوں:

۱- میک ٹیگرٹ نے کہا کہ Ego is real, God must go مگر اس سے دو ہزار سال پہلے سانکھ درشن اور جین دھرم نے یہی بات کہہ دی تھی، میک نے پرانی شراب کو نئی بوتل میں بھر دیا ہے۔

۲- ہرل نے کہا کہ صرف مظاہر موجود ہیں، مگر ان کی پشت پر کوئی حقیقت بھی ہے؟ اسے نہ ہم جانتے ہیں نہ جان سکتے ہیں، لیکن اس سے دو ہزار سال قبل ناگارجُن نے یہی بات کہہ دی تھی، جو بودھ دھرم کے چوتھے فلسفیانہ اسکول Nihilism کا سب سے بڑا شارح ہے، اور منطقی موشگافیوں کے لحاظ سے عصرِ حاضر میں اگر کوئی اس کا صحیح مدّمقابل ہے تو بریڈلے ہے۔

۳- ہیگل کی Absolute Idealims کا بڑا شہرہ ہے، مگر شری ولبھ اچاریہ نے پندرھویں صدی میں اس کی بہتر تعبیر پیش کردی تھی، بس یہ تین مثالیں کافی ہیں۔

میں نے اس غیر معمولی بات پر بہت غور کیا ہے اور میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں، جو میرا قیاس ہے، وہ یہ

ہے کہ غالباً اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ اور مشیتِ کاملہ کی بنا پر یہ فیصلہ فرمایا ہو کہ چوں کہ قرآن ابدی اور ارفع اور اعلیٰ صداقتوں کا حامل ہے، اور اس میں Profoundest Philosophy and Hidhest truth پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے گا، اس لیے اس وقت نازل کرنا مناسب ہوگا، جب عقلِ انسانی اپنی انتہا کو پہنچ جائے، یعنی اس ذروۂ کمال پر جس سے بالاتر مقام اس کے لیے عقلاً متصور نہ ہو سکے، جب لوگوں نے میری طرح انڈین فلاسفی Hinduism, Gainism and Buddhism کا بامعانِ نظر کم از کم پچاس ساٹھ سال تک مطالعہ کیا ہے، وہ یقینا مجھ سے متفق ہوں گے۔

جس وقت قرآن نازل ہوا تمام دنیا کے فلسفے اور مذاہبِ عالم وجود میں آچکے تھے، اور فکرِ انسانی اپنے کمال کو پہنچ چکی تھی، لہٰذا ساتویں صدی عیسوی میں یہ کتاب نازل ہوئی جو:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است　　　ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　　جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود
با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ　　　آنچہ از حاجت فزوں داری بدہ

واضح ہو کہ جو انقلاب قرآن نے پیدا کیا وہ نہ کسی فلسفے نے، نہ کسی مذہب نے نہ کسی Cult نے، نہ کسی تحریک نے، اور نہ کسی جماعت نے، نہ کسی فرقے نے، بقول M.N. Roy پیغمبر اسلام نے صرف ایک انقلاب ہی برپا نہیں کیا، بلکہ He was the Greatest Revolutionary the world has ever seen: آنحضرت ﷺ کے برپا کردہ انقلاب کے سامنے لینن کا انقلاب بچوں کا کھیل نظر آتا ہے، لینن نے شیاطین کی فوج پیدا کی، جب کہ آپ ﷺ نے Supremen کی جماعت تیار کردی، جنہوں نے دنیا کو عدل اور امن سے معمور کردیا، Vide "The Historical role of Islam" لینن نے صرف معاشی انقلاب برپا کیا، آں حضرت ﷺ نے ہمہ گیر انقلاب برپا کیا، لینن نے غور وفکر کا دروازہ بند کردیا، جب کہ:

The birth of Islam is in the eyes of a phil . The birth of inductive intellect in the world .

اب سوال یہ ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت دنیا میں مختلف النوع مذاہب بھی تھے اور فلسفے بھی اور اخلاقی ضوابط (Ethical codes) بھی، تو اسلام یا قرآن کی کیا ضرورت تھی؟ پیغمبر ﷺ نے کس کمی کو پورا کیا؟ بالفاظِ دیگر، قرآن کی کیا ضرورت تھی؟ یا آپ ﷺ کا کارنامہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ظہورِ اسلام یا بعثت نبوی ﷺ

کے وقت دنیا میں سب کچھ تھا، مگر توحیدِ باری تعالیٰ نہیں تھی، قرآن یا آں حضرت ﷺ نے اس کمی کو پورا کیا، اور دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے مکمل نظام عطا کر دیا، جو انسان کی زندگی کے ہر شعبے پر حکمران ہے، اور ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا میں حسبِ ذیل مذاہب موجود تھے:

۱- ''شِنٹو'' جاپان کا قومی یا قدیمی Indigenous مذہب ہے، اس کا مطلب ہے: قومی دیوتاؤں کا راستہ! ان دیوتاؤں کی سرتاج سورج کی دیوی ہے، سورج کی پوجا 600 B.C میں جاپان سے لے کر یونان تک ہوتی تھی، سورج کو خدا کا بیٹا (Son of God) کہتے تھے، از ہندوستان تا یونان، اس کے علاوہ ہر ملک میں مقامی خدا کے بیٹے معبود بنے ہوئے تھے، چونکہ بادشاہ سورج کی دیوی کی اولاد ہے، اس لیے اب شنٹوازم کا مطلب یہ ہے کہ شاہ پرستی، چناں چہ ولی عہد کو ''آفتاب کا مبارک فرزند'' کہتے ہیں، آج کل شنٹو مجموعہ ہے: شاہ و+فطرت+اسلاف پرستی کا۔ توحید الٰہی کا دور دور تک نشان نہیں مل سکتا۔

۲- Tao Ism کا بانی لاؤزی Lao-Tse تھا جو کنفیوشش کا ہم عصر تھا (تاریخ ولادت 604 B.C) اس کی تصنیف کا نام ''ٹاؤ ٹے گنگ'' ہے، جو اس مذہب کی مقدس الہامی کتاب سمجھی جاتی ہے، Tao کا لفظی معنی ہے راستہ یا طریق The absoluste in itself is unknowable آگے چل کر شرک اور بت پرستی، خانقاہیں، توحید غائب ہوگئی اور دیوی دیوتاؤں کی پوجا شروع ہوگئی، تم کائنات کو اپنی مرضی سے ہم آہنگ نہیں کر سکتے، اس لیے تم خود حالات سے ہم آہنگی پیدا کرلو۔

۳- کنفیوشش (551-473-B.C) اس نے اخلاقی اور سیاسی نظام پیش کیا، ان تینوں مذاہب میں توحیدِ ایزدی کی تعلیم نہیں ہے، شخصیت پرستی اور بت پرستی عام ہے۔

۴- ہندو دھرم میں شرک اور بت پرستی عام ہے۔

۵- جین دھرم اور......

۶- بودھ دھرم میں خدا کا انکار۔

۷- Zor میں یزداں اور اہرمن یعنی توحید کے بجائے ثنویت Dualism ہے۔

۸- مانی کا مذہب مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے۔ اس کی بنیادی تعلیم توحید نہیں بلکہ Matter is Evil۔ لہٰذا

مقصودِ حیات ترک دنیا ہے۔

۹- Gnosticism (مسلکِ عرفان) نصرانیت کے ابتدائی زمانے میں عیسائیوں میں ایک فرقہ پیدا ہوا تھا، چونکہ توحید کا حامی تھا اس لیے تثلیث نے اسے ختم کر دیا۔

۱۰- مزدکیت میں خدا کا کوئی تصور نہیں تھا، صرف معاشی نظام تھا، مزدک پہلا اشتراکی تھا، زن، زر اور زمین تینوں مشترک۔

۱۱- متھرا ازم: عیسائیت کا سب سے بڑا رقیب تھا، متھرا خدا کا اکلوتا بیٹا تھا، مصلوب ہوا، اب آسمان پر ہے۔

۱۲- صابی-عراق کے ستارہ پرست تھے، اور انہوں نے احبار کو "أَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" بنالیا۔

۱۳- یہودیت میں توحید تھی مگر رفتہ رفتہ عزیر ابن اللہ بنا دیا گیا۔

۱۴- عیسائیت میں بھی توحید تھی ،مگر ظہورِ اسلام کے وقت ساتویں صدی عیسوی میں توحید کی جگہ تثلیث دماغوں پر حکمران تھی، اور مسیح ابن اللہ تھا، جب خالدِ جانباز رضی اللہ تعالیٰ عنہ دمشق کے دروازے پر دستک دے رہے تھے، تو عیسائی یہ بحث کر رہے تھے کہ ولادتِ یسوع کے بعد مریم Virgin رہیں یا نہیں؟ یسوع انسان تھے یا خدا یا دونوں؟ متعدد فرقے اس طرح لڑ رہے تھے، جس طرح چنگیز اور ہلاکو کے زمانے میں احناف اور شوافع ،معتزلہ اور اشاعرہ، سنی اور شیعہ آپس میں لڑ رہے تھے۔

۱۵- مجوسیت: یہ زرتشی مذہب کی بگڑی ہوئی شکل تھی، خدا پرستی کے بجائے آتش پرستی اور رسوم پرستی، یہ حالات تھے جب ۶۱۰ء میں آں حضرت ﷺ نے مکے میں توحیدِ ایزدی کا علم بلند کیا، یہ دنیائے مذہب کا سب سے بڑا انقلاب تھا۔

Mohammad is certainly the greatest revolutionary the world has ever seen as well as the most successful of all the religious. Personalities of the world.

چوں کہ قرآن کے ساتھ دین کامل ہو گیا اور نعمت تمام ہو گئی، اس لیے مشیت نے دین کی روح یعنی توحید باری کو اس طرح کامل کر دیا کہ اس پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا، اور شرک کے تمام رستوں کو اس طرح مسدود کر دیا کہ اب کوئی شخص انتہائی کوشش کے باوجود کوئی چور دروازہ نہیں کھول سکتا، اور میرے طویل مطالعے اور غور و فکر کی رو

سے قرآن یا اسلام کا کمال بس اسی میں مخفی یا مضمر ہے:

No body can improve upon the doctrine of the unity of God as propounded by the unlettered Prophet. of the desert.

ورنہ اخلاقی تعلیم تو سب مذاہب میں موجود تھی، قرآن کو اس باب میں کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے، ہاں اسے یہ فخر ضرور حاصل ہے کہ اس نے شرک کی تمام ممکن صورتوں کو مٹا دیا، اور چوں کہ صرف مردِ حُر توحید کے اقتضاء پر عمل کرسکتا ہے، اس لیے قرآن وحدیث نے غلامی کی تمام صورتوں کو بھی مٹا دیا ہے ؎

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے گدائے رہ نشیں

کانٹ کہتا ہے کہ جب تک انسان کو حریتِ کاملہ حاصل نہ ہو وہ اخلاقی زندگی بسر نہیں کرسکتا، کاش! کوئی مسلمان کانٹ کو بتاتا کہ یہ نعمت صرف آپ ﷺ نے انسان کو دی، انسان کی بنیادی کمزوری شرک ہے، اس لیے قرآن یا آں حضرت ﷺ نے شرک کی تمام صورتوں، یعنی شرک فی الوجود، شرک فی الذات، شرک فی الصفات، شرک فی الحکم، شرک فی العبادات، شرک فی التصرف، شرک فی التاثیر اور شرک فی الآثار کو مٹا دیا۔

جب انسان کو حریتِ کاملہ حاصل نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرسکتا، اس لیے آپ ﷺ نے غلامی کی تمام صورتوں، یعنی جسمانی غلامی، ذہنی غلامی، ضمیر کی غلامی، نفس ناطقہ کی غلامی، علم (حاصل کرنے) کی غلامی، پیشے کی غلامی، رنگ، نسل اور ذات پاک کی غلامی، سیاسی غلامی اور معاشی غلامی کو مٹا دیا، چونکہ بانیانِ مذاہب کو خدا بنایا گیا تھا، اس لیے آپ ﷺ کو حکم ہوا: {قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ} (کہف:۱۱۰)

جس دین نے ساری دنیا کو ہر قسم کی غلامی سے رہائی بخشی تھی، ۱۹۴۷ء میں اس دین متین کے پیرو کار ہر قسم کی غلامی میں مبتلا ہیں، اور مزید کرم یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے تا ایں دم غلامی کی ہر نوع میں روز بروز شدت وغلظت ہوتی جارہی ہے، آں حضرت ﷺ توحید کے سب سے بڑے علمبردار ہیں، لیکن آپ کے عشاق اس وقت شرک کے سب سے بڑے حامی اور مشرکوں کے سب سے بڑے سردار ہیں، اصلاحِ احوال کی صرف ایک ہی صورت ہے ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

{وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعاً وَّلاَ تَفَرَّقُوْا} (آل عمران:۱۰۳)

یعنی مسلمان کو تدبر فی القرآن کی دعوت دینا، میرا عقیدہ ہے کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھ لینے کے بعد کوئی شخص شرک کی کسی صورت کا بھی ارتکاب نہیں کرسکتا، پس قرآن خود پڑھو اور دوسروں کو بھی پڑھاؤ ؎

من آنچہ شرطِ بلاغ ست باتومی گویم تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

آپ ﷺ کی خصوصیات:

۱- آپ ﷺ کی شخصیت صحیح تاریخی طور پر ثابت ہے، اگر میں مناظرانہ رنگ میں ہنود یا مجوس وغیرہ سے کہوں کہ رام یا کرشن یا زرتشت وغیرہ کی شخصیت تاریخی طور پر ثابت کرو، تو سب دم بخود ہو جائیں گے۔

۲- دوسری خصوصیات: آپ ﷺ نے اپنی وفات سے قبل اپنا پیغام کتابی صورت میں مکمل امت کو دے دیا، جس کی Genuineness authencity and integrity and purity کا اعتراف اپنے تو اپنے دشمنوں کو بھی ہے، ولیم میؤر نے ۱۸۶۱ء میں لکھا تھا:

There is no book under the sun which for the last qw century has remained with so pure a text .

۳- آپ ﷺ کی زندگی اگر چہ محدثین کی کوششوں سے محفوظ ہے، لیکن (بالفرض محال) آپ کی تیسری خصوصیات یہ ہے کہ ساری حدیث کی کتابیں تلف ہو جائیں، تو صرف قرآن سے آپ ﷺ کی سیرت مرتب ہوسکتی ہے، CF گیتا سے شری کرشن کی لائف مرتب نہیں ہوسکتی، توریت سے موسیٰ علیہ السلام کی، زبور سے حضرت داؤد علیہ السلام کی اور انجیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی، دھمپد سے گوتم بدھ کی، انگ سے مہاویر کی حیات مرتب نہیں ہوسکتی۔

۴- آپ ﷺ واحد پیغمبر یا مصلح ہیں، جس نے جو تعلیم دی اس پر خود بھی عمل کر کے دکھایا اور دوسروں سے بھی عمل کرادیا۔

۵- آپ ﷺ واحد پیغمبر یا رسول یا مصلح ہیں، جس نے اضداد کو جمع کر دیا۔

۶- آپ ﷺ کی پوری زندگی محفوظ ہے۔

۷- آپ ﷺ نے بیک وقت تین نعمتیں دنیا کو دیں، یہ فخر کسی مصلح کو حاصل نہیں ہے، آپ ﷺ نے ایک قوم بنائی، اسے مکمل آئینِ حیات دیا اور مکمل اخلاقی نظام :Highest ethical ideal اور اخلاقی نصب العین پھر بالفعل حکمران بنادیا، تاکہ دنیا قول اور عمل میں مطابقت کا نظارہ دیکھ سکے۔

۸- اللہ رب العالمین ہے، آپ ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں۔

۹- اللہ کائنات پر رؤف اور رحیم ہے، آپ ﷺ مؤمنوں پر۔

۱۰- آپ ﷺ پر نبوت ختم ہوگئی، کمالاتِ نبوت ختم ہوگئے، آپ ﷺ کی ختمیّت بقول حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: ذاتی ہے، اور آپ کی امت خیر الامم ہے، کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ۔

(آل عمران:۱۱۰)

۱۱- آپ ﷺ کی گیارہویں خوبی یا خصوصیتِ تعلیم یہ ہے کہ انسانی شخصیت کے تینوں پہلوؤں: علم وجذبہ اور ارادہ کی یکساں تربیت Harmonious development کا دستور العمل عطا کر دیا۔

۱۲- جہاد فی سبیل اللہ کو رہبانیتِ اسلام قرار دیا، یعنی اسلام میں ترکِ دنیا ہے، مگر وہ غار وکوہ میں خلوت نشینی کا نام نہیں، بلکہ میدانِ جہاد میں اللہ تعالیٰ کے لیے ترکِ دنیا کر دینا۔

۱۳- آپ ﷺ نے مختصر عرصہ ایک لاکھ سے زائد انسانوں کو شرک اور بت پرستی، شخصیت پرستی اور اوہام پرستی سے پاک کر دیا، اور ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور دینِ اسلام کی محبت کا رنگ پیدا کر دیا۔

ہمارا فرض:

ہمارا فرض اس وقت یہ ہے کہ ہم روحانیت اور مادیت میں امتزاج کے طریق کار کو، جو آپ ﷺ نے ہمیں مذہب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عطا کیا، دنیا میں عام کر دیں، اس کے دو فائدے ہوں گے:

۱- ہم موردِ فضلِ الٰہی بن جائیں گے۔

۲- یورپ کو اس وقت اسی نسخے کی ضرورت ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ یورپ اسلام کے مطالعے کی طرف مائل ہوجائے گا۔ [CF لارڈ لوتھین کا مشورہ ۱۹۳۸ء]۔ (تعمیر افکار، سیرت نمبر: ص/ ۲۵۷ تا ۲۶۴)

پروفیسر عبد الجبار شیخ تحریر فرماتے ہیں:

آپ ﷺ کے مرتبۂ کمال کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ آپ کی سیرتِ مطہرہ پوری جامعیت اور کاملیت کے ساتھ آغاز سے لے کر آج تک موجود اور محفوظ ہے، اور ابد تک آپ ﷺ کی زندگی کا ایک ایک گوشہ موجود اور محفوظ

رہے گا، نہ اسے آج تک کسی قسم کی آنچ آئی اور نہ ہی قیامت تک اس کے صرفِ نظر ہونے کا کوئی بھی اندیشہ ہے، حالاں کہ انبیاء کے جس قدر نفوسِ قدسیہ اس دنیا میں تشریف لائے ہیں، آپ کے علاوہ کسی کی سیرت آج مکمل محفوظ نہیں، اگر کچھ چیزیں ہیں بھی تو وہ صرف چند اشارے، کچھ ہدایات اور کچھ احکام ہیں جو آسمانی کتابوں میں موجو دہیں، ورنہ مفصل حالات نظروں سے بالکل اوجھل اور مخفی ہیں، آج اگر ہم یہ چاہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی ساری زندگی ہمارے سامنے ہو، یا عیسیٰ علیہ السلام کے حالات از آغاز تا انجام ہمیں پوری طرح معلوم ہو جائیں، تو یہ بات بالکل ناممکن ہے، حالاں کہ یہ تو وہ انبیاء ہیں جن کے نام نامی مشہور ہیں اور قرآن میں بھی ان کا ذکر ہے، ہزاروں انبیاء ایسے ہیں کہ تاریخ میں ان کا نام تک بھی نہیں، لا تعداد انبیاء ایسے گزرے ہیں کہ کسی کی سیرت اور کسی کی شریعت آج محفوظ نہیں۔

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

مصادرِ سیرۃ النبی ﷺ

مصادر سیرت یعنی سیرت نگاری میں کن کتابوں سے استفادہ کیا جائے اس سلسلہ میں مختلف مصنفین، مختلف انداز سے مصادر کو ذکر کرتے ہیں، فاروق حمادہ اپنی کتاب "مصادر السیرۃ النبویۃ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر بے حد وحساب لکھا گیا، مسلمانوں نے بھی لکھا اور غیر مسلموں نے بھی، مگر چونکہ آپ کی سیرت کوئی عام "سوانح حیات" کے مانند نہیں، بلکہ شریعت اسلامیہ کی عملی صورت ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے مصادر کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کر کے آپ کی سیرت کو علمی و تحقیقی انداز میں پڑھا اور لکھا جائے، میری اپنی رائے یہ ہے کہ "مصادر سیرت" کی دو قسمیں ہیں: (۱) مصادر اصلیہ، (۲) مصادر فرعیہ۔

قرونِ اولیٰ کے بعد ایسے افراد آئے جنہوں نے سیرت نبوی کو مستقلاً اپنی تصنیفی و تالیفی کاوش کا میدان بنایا اور مذکورہ "مصادر اصلیہ" سے سیرت کے متعلق مواد کو جمع کیا۔

ابتداءً سیرت پر لکھی جانے والی ان تصنیفات کو"مصادر فرعیہ" کا درجہ دیا جاتا ہے،اس میں کوئی شک نہیں کہ سیرت کے مستقلاً ایک علیحدہ فن کی حیثیت اختیار کر لینے کے بعد علماء اس پر شہد کی مکھیوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور بے شمار کتابیں تصنیف وتالیف سے آراستہ کردی،۔جس کے صرف ناموں کا یکجا کرنا بھی دشوار ہے، میں یہاں چند مشہور ومعروف مستند ومتداول کتابوں کا نام ذکر کردیتا ہوں۔

(۱) الشفابتعریف حقوق المصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (قاضی عیاض الیحصی)

(۲) عیون الأثر في فنون المغازي والشمائل والسير (ابن سيد الناس)

(۳) السيرة النبوية (اسماعيل ابن كثير الدمشقي)

(۴) زاد المعاد في هدي خير العباد (ابن القيم الجوزي)

(۵) السيرة النبوية (امام ذهبي)

(۶) الإشارة إلى سيرة المصطفى صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (المغلطائي)

(۷) امتاع الاسماع (المفريزي)

(۸) سبيل الهدى والرشاد (الصالح) (مستفاد از مصادر السيرة النبوية وتقويمها)

دکتور رصیف اللہ بن یحی الزہرانی "مصادر السیر ۃ النبو یۃ" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے احادیث نبویہ تدوین وکتابت کے بعد سیرت کی تدوین وکتابت کی طرف خاص توجہ مبذول کی اور جلیل القدر تابعی عروہ بن زبیر نے سب سے پہلے اس پر طبع آزمائی کی، ان کے بعد ابان ابن عثمان، وہب ابن منبہ، شرحبیل ابن سعد، امام ابن شہاب زہری نے اس کام کو آگے بڑھادیا اوران کے بعد آنے والوں نے مکمل وقت اور اتقان کے ساتھ سیرت کو مرتب کرنا شروع کیا، جس کے سرخیل محمد ابن اسحاق ہیں، ان کے بعد ابن ہشام ہے جنہوں نے سیرت پر سب سے پہلا جامع کارنامہ انجام دیا، اس کے بعد تو پے درپے تصانیف کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور اتنی کتابیں سیرت پر معرض وجود میں آئی کہ احاطہ مشکل ہوگیا، اوراب تو"مصادر السیر ۃ" کے عنوان سے ایک سیرت کا گویا نیا پہلو ظاہر ہوگیا ہے، اس پر بہ کثرت کتابیں لکھی جارہی ہے، اسی سے سیرت کے وسیع دائرے کا پتا چلتا ہے۔

مصادر سیرت دو طرح ہیں:

(۱) المصادر الاساسیۃ (المباشرۃ)۔ (۲) المصادر التعلیمیۃ (الیأ کیف غیر المباشرۃ)

مصادر اصلیہ :

(۱) قرآن کریم (۲) کتبِ احادیث (۳) سیرت پر لکھی گئی کتابیں۔ (۴) دلائل وشمائل پر لکھی گئی کتابیں۔

مصادر تعلیمیہ :

کتب تراجیم (۲) کتب اسماء رجال (۳) کتب انساب (۴) کتب فقہ (۵) الاولین ادب وغیرہ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مصادر سیرت گویا اب سیرت کا ایک ذیلی فن کی صورت اختیار کر گیا ہے، دکتور عبدالرزاق ہرماس اپنی مایۂ ناز کتاب ''مصادر السیرۃ النبویۃ بین المحدثین والمؤرخین'' میں ''القرون الاوائل بمصادر السیرۃ'' کے عنوان کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ پہلی اور دوسری صدی میں روایت اور سماع پر مدار ہوتا تھا، اس کے بعد جیسے عرب قبائل نے احادیث اور انساب کے حفظ کا اہتمام کیا، اسی طرح واقعاتِ سیرت کے حفظ کا بھی اہتمام کیا، اور انہیں احادیث اور تفسیر پر لکھی گئی کتابوں کے ذیل میں ذکر کیا، قرن اول کے اخیر میں'' مغازی'' کے نام سے سیرت کی بنیاد ڈالی گئی، عروہ ابن شہاب، موسیٰ بن عقبہ، معمر بن راشد وغیرہ نے اس کا خاص اہتمام کیا۔

خطیب بغدادی کے بیان کے مطابق سیرت کی تدوین پر بھی بڑی عرق ریزی سے کام لیا گیا، واقدی فرماتے ہیں: میں نے شہداء اور صحابہ کی اولاد میں سے جب بھی کسی سے ملاقات کی تو اس سے پوچھا کہ تم نے شہید کے مقام قتلی کے بارے میں کسی سے سنا کہ وہ کہاں شہید ہوئے؟ پھر جب مجھے وہ مقام شہادت پر مطلع کرتا تو میں بذات خود وہاں جا کر اس جگہ کا معاینہ کرتا اور پھر اس کی تفصیلات کو قلمبند کرتا اور روایت کرتا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی شہید کے مقام شہادت کو معلوم کیا اور پھر اس جگہ میں نہیں گیا۔ (تاریخ بغداد: ۲۱۵۳)

گویا پہلی دو صدیوں میں اسی طرح سیرت کی معلومات کو علماء نے بڑی جاں فشانی کے ساتھ جمع کیا، قرنِ ثانی کے اختتام کے ساتھ ہی سیرت گویا روایات کے ساتھ مکمل طور پر کتب میں جمع ہوگئی، لہٰذا قرنِ ثالث کے مصنفین نے سیرت کے جس مواد کو جمع کیا وہ انہیں قرن ثانی کے تحقیقات شدہ روایات سے تھا، مثلاً ابن سعد نے طبقات میں اپنے استاذ واقدی کے اکثر مغازی کی روایات نقل کی، اور خلیع فیاط نے ابن اسحاق سے اور انہوں نے بکر بن سلمان سے، اسی طرح قرنِ ثالث میں دسیوں کتابیں وجود میں آئی، اور قرنِ رابع کے آنے تک مختلف انداز میں سیرت پر کام تیز ہوگیا، ابن عبدالبر نے مقدس کتابوں سے استفادہ کر کے مغازی پر معلومات جمع کی،

قاضی عیاض نے آیات قرآنیہ کو اپنی سیرت نگاری کے لیے اساس قرار دیا، اسی لیے ان کی کتاب ''الشفاء'' میں تفسیرات قرآنیہ کے حوالے زیادہ ہیں، مثلاً ابواللیث عبدالنزہ حسین جیانی ماوردی وغیرہ کے حوالے زیادہ ہیں، اس کے بعد متأخیرن نے سیرت پر کتابوں کا انبار لگادیا، متأخرین عام طور پر سیرت کے لیے تفسیر حدیث، تاریخ وسیر تمام مراجع ومصادر سے استفادہ کرتے آرہے ہیں۔

''مصادر سیرت'' کا اہتمام آخری سو سال سے ہورہا ہے جس کا آغاز سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کے خطبات ''خطبات مدراس'' سے ہوا، اس کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے ''وثائق نبویہ'' کے مصادر پر گفتگو کی ہے، موصوف نے ''نبی الاسلام'' کے مقدمہ میں بھی ''المواد والمصادر'' کے عنوان سے بحث کی ہے۔

الدکتور مصطفی سباعی نے بھی ''السیرۃ النبویہ دروس وعبر'' کے مقدمہ میں ''مصادر سیرت'' سے بحث کی ہے، اسی طرح الدکتور عمر فردخ نے بھی ''تاریخ صدر الاسلام'' کے مقدمہ میں مصادر سے بحث کی ہے، اس کے بعد محمد سعید رمضان بوطی نے ''فقہ السیرۃ'' کے مقدمہ میں، دکتور اکرم ضیاء نے ''السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ'' کے مقدمہ میں، اس کے بعد بعض کتابیں مستقلاً اسی موضوع پر شائع ہوئی مثلاً:

(۱) السيرة النبوية في ضوؤ مصادرها الأصلية (الدكتور مهدي رزق الله احمد)

(۲) مصادر السيرة النبوية وتقويمها (الدكتور فاروق حمادة)

(۳) مصادر السيرة النبوية بين المحدثين والمؤرخين (الدكتور عبدالرزاق هرماس)

(۴) مصادر السيرة النبوية (ضيف الله بن يحى الزهراني)

چناں چہ دکتور مہدی رزق اللہ احمد ''سیرتِ نبوی ﷺ'' میں مآخذ ومصادر سیرت طیبہ کو یوں تحریر فرماتے ہیں:

سیرتِ طیبہ کے مآخذ ومصادر:

(۱) قرآن مجید (۲) حدیثِ نبوی (۳) کتبِ شمائل (۴) دلائل نبوت اور معجزات کے متعلق کتابیں (۵) کتبِ خصائص (۶) کتبِ سیرت ومغازی (۷) حرمین شریفین کے بارے میں تاریخی کتابیں (۸) عام تاریخی کتب (۹) دیگر تاریخ کتابیں (۱۰) ادبی کتابیں۔

قرآن مجید:

قرآن مجید کی بہت سی آیاتِ کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا عکس دکھائی دیتا ہے، قرآن کریم

ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ یہ جس پر اترا وہ مقدس انسان کون تھا؟ کن لوگوں میں آیا؟ اس کے شب و روز کس طرح گزرتے تھے؟ اس کے دوست کون تھے اور دشمن کون تھے؟ اس کے عادات و خصائل کیسے تھے؟ اس کی دعوت کیا تھی؟ وہ کس جمیل و جلیل ہستی کی بندگی کی دعوت دیتا تھا اور اس دعوت کے فیضان سے یہ دنیا ارتقائی مراحل طے کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ گئی؛ ان قرآنی آیات کا سرسری جائزہ ہی ان حقائق کے ثبوت کے لیے کافی ہے، قرآن کریم نے یہ پہلو اس قدر اجاگر کیا ہے کہ صرف اسی کی مدد سے رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ پر ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے، استاذ محمد عزت دروزہ نے اس موضوع پر دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی جس کا نام "سیرة الرسول صلى الله عليه وسلم صورة مقتبسة من القرآن الكريم" (سیرتِ رسول قرآن کریم کے آئینے میں) ہے۔ چوں کہ قرآن کریم لاریب کتاب ہے، اس کا ثبوت قطعی ہے اور یہ صحیح ترین بیان ہے، لہٰذا سیرتِ نبوی کا اولین اور اصل ماخذ قرآن کریم ہی ہے، یہ ثابت کرنے کے لیے مزید کلام کی ضرورت نہیں، کیوں کہ اس کا انکار ایمان سے دست بردار ہونے کے مترادف اور علم وعقل سے بے بہرہ ہونے کی علامت ہے، قرآن مجید نے قبل از اسلام عربوں کی دینی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی کے بارے میں بہت سے معاملات کی تصویر کشی کی ہے، اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید نے جزیرہ نمائے عرب اور اس کے قرب وجوار کی دیگر قدیم تہذیبوں پر بھی روشنی ڈالی ہے، جس سے طلوع اسلام اور اس سے پہلے کے انسانی معاشرے کی پوری حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

قرآن مجید سے سیرتِ نبوی کے مطالعے اور استفادے کے لیے ضروری ہے کہ قرآنی تفاسیر بالماثور کی طرف رجوع کیا جائے جن میں مختلف آیات کی تفسیر میں احادیث باسند نقل کی گئی ہیں، ناسخ منسوخ کا بیان ہے اور اسبابِ نزول کا مفصل تذکرہ ہے، البتہ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جن احادیث سے مفسرین استدلال کرتے ہیں وہ معیار کے لحاظ سے ایک جیسی نہیں بلکہ ان میں صحیح، حسن، ضعیف، نہایت کمزور اور غیر معتبر، ہر قسم کی روایات موجود ہیں، چناں چہ ضروری ہے کہ جرح وتعدیل کے اصولوں کے مطابق اُن روایات کو پرکھا جائے اور انہی روایات کو لیا جائے جو ائمہ حدیث کے نزدیک صحیح یا کم از کم قابلِ حجت ہوں۔

تفسیر بالماثور کی چند معتبر اور مشہور تفاسیر یہ ہیں: تفسیر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تفسیر ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ)، تفسیر ابن جوزی (متوفی ۵۹۷ھ)، اور امام سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی تفسیر "الدر المنثور فی التفسیر الماثور"، جس میں جلیل القدر مصنف نے سابقہ تفاسیر کی تلخیص کی ہے، اور اُن تمام نصوص پر روشنی ڈالی ہے جو سابقہ تفاسیر میں نظر انداز ہو گئی تھیں۔ (مصادر السیرۃ النبویۃ وتقویمہا للدکتور فاروق احمد حمادہ: ص/ ۳۴، ۳۵)

حدیثِ نبوی:

کتبِ احادیث میں رسول اللہ ﷺ کے تمام اقوال وافعال اور تقاریر خوش اسلوبی سے جمع کر دیئے گئے ہیں، اور آپ کی شکل وصورت، اخلاقِ عالیہ اور معجزات وخصائص کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے، بعض کتابوں میں آں حضرت ﷺ کے غزوات وسرایا کی تفصیلات کہیں ابواب کی صورت میں اور کہیں متفرق روایات کی شکل میں بیان کی گئی ہیں۔

سب محدثین کے ہاں سیرت نگاری کا اپنا اپنا اسلوب ہے، مثلاً: امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "صحیح بخاری" میں نبوت سے پہلے اور بعد از نبوت آں حضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ، غزوات وسرایا، خطوط، صحابۂ کرام اور ازواجِ مطہرات کے فضائل کے بیان میں با قاعدہ الگ الگ ابواب اور عنوان قائم کیے ہیں، اگر چہ دیگر تمام روایات اور ابواب میں بھی رسالتِ مآب ﷺ کی سیرت کی متفرق جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں، اسی طرح امام مسلم رحمہ اللہ نے ابھی اپنی صحیح میں رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ، خاص طور پر غزوات وسرایا کے ضمن میں الگ الگ ابواب باندھے ہیں، اسی طرح فضائل النبی ﷺ، فضائل الصحابہ اور باب الامارہ کے علاوہ دوسرے ابواب میں بھی سیرتِ طیبہ کے حوالے سے بے شمار احادیث موجود ہیں۔

مستدرک حاکم جسے امام حاکم نیشاپوری رحمہ اللہ نے امام بخاری اور امام مسلم کی شروطِ روایت کے مطابق مدوّن کیا ہے، یہ خود انہی کا دعویٰ ہے، اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے بہت سی احادیث کے بارے میں ان دعویٰ تسلیم بھی کیا ہے اور کئی احادیث میں اُن کے فیصلے کی موافقت نہیں کی، اس کتاب میں بھی غزوات وسرایا سے متعلقہ بہت سی احادیث ہیں جو الگ الگ ابواب میں آئی ہیں۔

سننِ اربعہ میں سے جامع ترمذی میں سیرت کا مفصل تذکرہ موجود ہے، خصوصاً ابواب المناقب میں سیرتِ طیبہ کے بارے میں گرانمایہ معلومات ملتی ہیں، اِس کے بعد سنن ابی داؤد اور پھر سنن ابن ماجہ کا نام آتا ہے، خاص طور پر اُس کی کتاب الجہاد- آخر میں سنن نسائی ہے جس میں سیرت کے متعدد پہلوؤں کے بارے میں مفید تذکرے موجود ہیں۔

امام بیہقی رحمہ اللہ کی سنن کبریٰ سیرتِ طیبہ کے معتبر اور مستند واقعات سے بھرپور ہے۔

مسانید کی کتابوں میں مسند امام احمد سب سے زیادہ بلند پایہ ہے، غزوات اور سرایا کے تحت اِس میں سیرت سے متعلقہ بہت سے واقعات ہیں، اس میں سیرت اور مناقب کے ابواب خاص طور پر اسی موضوع کے

بارے میں ہیں، جن میں سیرتِ طیبہ کی بیش بہا تفصیلات جلوہ گر ہیں، میری معلومات کے مطابق سیرتِ نبوی کا سب سے زیادہ سرمایہ کتبِ احادیث میں سے مسند احمد میں پایا جاتا ہے، اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیوں کہ یہ کتاب تیس ہزار سے چالیس ہزار احادیث کی جامع ہے، ظاہر ہے کہ جب احادیث اتنی کثیر تعداد میں ہیں تو یقینا ان میں سیرت سے متعلقہ احادیث بھی بڑی تعداد میں ہوں گی (ہمارے ہاں عام طور پر پائے جانے والے نسخوں میں احادیث کی ترقیم تقریباً اٹھائیس ہزار تک مکمل ہوجاتی ہے، یہ تعداد شاید نسخوں کے فرق کی وجہ سے ہے)۔

کتبِ شمائل:

اگر چہ شمائل (عادات وخصائل) سے متعلقہ اکثر احادیث کتبِ حدیث کے مختلف ابواب کے تحت درج ہوتی ہیں، تاہم بعض محدثین نے اس عنوان کے تحت مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں، جب کہ بعض دیگر محدثین نے اپنی کتب میں اس عنوان سے خصوصی ابواب قائم کیے ہیں، مثلاً: صحیح بخاری میں ''الاستیذان، اللّباس'' وغیرہ۔ صحیح مسلم میں ''البر و الصلة و الأدب، الآداب، فضائل النبی ا، اللّباس و الزینة، الزھد و الرّقاق'' وغیرہ۔ اسی طرح جامع ترمذی میں ''البر والصلة، الاستیذان'' وغیرہ۔ اورسنن ابن ماجہ میں ''الأدب، الزھد'' وغیرہ۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے شمائل کے نام سے ایک جداگانہ خصوصی تصنیف مرتب کی ہے۔...... امام ابوالشیخ نے کتاب ''اخلاق النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم و آدابہ'' تصنیف کی، علامہ بغوی رحمہ اللہ نے ''الأنوار فی شمائل النبی المختار'' نامی کتاب لکھی اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ''الأدب المفرد'' تصنیف کی۔ ان کتب میں صحیح اورضعیف، ہر قسم کی احادیث موجود ہیں، چناں چہ ضروری ہے کہ ان میں سے صحیح اور معتبر کو اختیار کیا جائے۔

دلائل نبوت اور معجزات کے متعلق کتابیں:

دلائل اور معجزات سے متعلقہ احادیث بھی حدیث کی کتابوں میں شامل ہوتی ہیں، مگر بعض اہلِ علم نے علیحدہ طور پر اس عنوان سے خصوصی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، اگر چہ اس سلسلے کی بہت سی کتابیں ضائع ہوچکی ہیں، مگر ابو نُعیم اصبہانی کی ''دلائل النبوۃ'' اور حافظ احمد بن حسین بیہقی کی ''دلائل النبوۃ'' اب بھی ملتی ہیں۔ امام بیہقی رحمہ اللہ کی تحریر کردہ کتابِ سیرت انتہائی نفیس ہے، نام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صرف معجزات کا تذکرہ ہوگا، مگر درحقیقت مصنف رحمہ اللہ نے اس کتاب میں سیرتِ نبوی سے متعلقہ نہایت قیمتی سرمایہ جمع کر دیا ہے، یہ اہم کتاب سات جلدوں میں چھپ چکی ہے، چوں کہ مصنف نے سابقہ تمام کتب سے استفادے کے بعد یہ کتاب لکھی ہے، اس لیے یہ کتاب سیرتِ نبوی اور غزوات وسرایا کے سلسلے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے، جس سے کوئی مؤرخ صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''**الخصائص الکبریٰ**'' میں تمام سابقہ کتبِ حدیث سے دلائل ومعجزات سے متعلقہ تمام معلومات بڑی حد تک جمع کر دی ہیں۔

کتبِ خصائص:

اس موضوع پر دو ہی کتابیں قابلِ ذکر ہیں، ایک علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی ''**الخصائص الکبریٰ**'' اور دوسری امام شامی رحمہ اللہ کی ''**سبل الھدیٰ والرشاد**'' جو اپنے موضوع پر انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔

کتبِ سیرت ومغازی:

اس میں شک نہیں کہ کتبِ مغازی کی معلومات انہی روایات سے حاصل ہوتی ہیں، جو کتبِ حدیث میں بیان کی گئی ہیں، حتی کہ محدثین، حدیث یا سنت کی تعریف کرتے ہیں، تو اس میں سیرت کو بھی شامل کرتے ہیں کہ جو بات بھی رسول اللہ ﷺ سے منقول ہو وہ حدیث ہے، چاہے وہ آپ کا قول، عمل یا تقریر ہو، یا وہ بات آپ کے اخلاق یا جسمانی خط وخال یا سیرت سے تعلق رکھتی ہو۔

یہ حقیقت پہلے ہی عرض کی جا چکی ہے کہ حدیث کی کتابیں ہی سیرت کا اصلی ماخذ ہیں، اور سیرت کی تمام چھوٹی بڑی معلومات کتبِ حدیث ہی سے حاصل ہوتی ہیں، چناں چہ خود محدثینِ کرام نے محنت شاقہ سے کام لیا اور اسوۂ حسنہ پر جداگانہ کتابیں تحریر کر دیں۔

پہلی صدی ہجری کے سیرت نگار:

ہمارے علم کے مطابق ''سیرت'' یا ''غزوات وسرایا'' کے موضوع پر سب سے پہلے جن لوگوں نے الگ کتابیں لکھیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

ﷺ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما......انہوں نے ۶۸ھ میں رحلت فرمائی۔

ﷺ حضرت سعید بن سعد بن عبادہ خزرجی رضی اللہ عنہما...... جو رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی میں پیدا ہوئے تھے، یہ حضرت شرحبیل کے والد ہیں۔

ﷺ حضرت سہل بن ابی حثمہ مدنی انصاری رضی اللہ عنہما......وہ ۳ھ میں پیدا ہوئے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں وفات پائی۔

ﷺ تابعین میں سے حضرت عروہ بن زبیر بن عوام، وہ ۹۳ / ۹۴ھ کے مابین فوت ہوئے۔

ﷺ حضرت سعید بن مسیب مخزومی......وہ ۹۴ھ میں فوت ہوئے۔

ﷺ حضرت ابان بن عثمان بن عفان......وہ۸۶-۱۰۵ھ کے مابین فوت ہوئے۔

ﷺ ابوفضالہ حضرت عبداللہ بن کعب بن مالک انصاری......وہ۹۷ھ میں فوت ہوئے۔

دوسری صدی ہجری کے سیرت نگار:

ﷺ حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق، متوفی ۱۰۷ھ۔

ﷺ حضرت وہب بن منبہ، متوفی ۱۱۴ھ۔

ﷺ حضرت شرحبیل بن سعید، متوفی ۱۲۳ھ۔

ﷺ حضرت ابوروح یزید بن رومان اسدی، متوفی ۱۳۰ھ۔

ﷺ ابو اسود محمد بن عبد الرحمن بن نوفل اسدی جو یتیمِ عروہ کے نام سے معروف تھے، متوفی ۱۳۱ھ۔

ﷺ حضرت عبداللہ بن ابی بکر بن حزم، وہ ۱۳۰-۱۳۵ھ کے مابین فوت ہوئے۔

ﷺ حضرت موسیٰ بن عقبہ، متوفی ۱۴۱ھ۔

ﷺ حضرت محمد بن اسحاق بن یسار مطلبی مدنی، متوفی ۱۵۱ھ۔

ﷺ حضرت یونس بن یزید ایلی، متوفی ۱۵۲ھ۔

ﷺ حضرت معمر بن راشد، متوفی ۱۵۴ھ۔

ﷺ حضرت ابومعشر سندھی، وہ ۱۷۰ھ کے بعد فوت ہوئے۔

ﷺ حضرت ابواسحاق فزاری، متوفی ۱۸۶ھ۔

ﷺ حضرت ولید بن مسلم دمشقی، متوفی ۱۹۵ھ۔

تیسری صدی ہجری کے سیرت نگار:

ﷺ محمد بن عمر واقدی، متوفی ۲۰۷ھ۔

ﷺ عبدالرزاق بن ہمام صنعانی، متوفی ۲۱۱ھ۔

ﷺ سعید بن مغیرہ بن صیادَ مصّیصی، متوفی ۲۲۰ھ۔

ﷺ احمد بن محمد ورّاق، متوفی ۲۲۸ھ۔

ﷺ محمد بن سعید بن منیع زُہری، متوفی ۲۳۰ھ۔

ﷺ محمد بن عائذ قرشی، متوفی ۲۲۴ھ۔

ﷺ سلیمان بن طرخان تیمی، متوفی ۲۴۵ھ۔

ﷺ ہشام بن عمار، متوفی ۲۴۵ھ۔

ﷺ سعید بن یحییٰ اموی، متوفی ۲۴۹ھ۔

ﷺ عمر بن شبہ بن عبید، متوفی ۲۶۲ھ۔

بعض مؤرخین نے ان سیرت نگاروں کو چار طبقات میں تقسیم کیا ہے، پہلے طبقے کے مشہور سیرت نگار'ابان ،عروہ، شرحبیل اور ابن منبہ ہیں' ۔اگر چہ ان حضرات کی اصل کتابیں ہمیں نہیں ملیں ،لیکن بعد کے ادوار کے مفسرین، محدثین اور سیرت نگاروں کی کتابوں میں ان کی بہت سی مرویات بڑی وضاحت سے مذکور ہیں۔

مشہور مستشرق ''بیکر'' نے حضرت وہب کی ''مغازی'' کا ایک حصہ بُردی اوراق پر لکھا ہوا پایا، جو شٹارن ہارٹ کے ذخیرے میں محفوظ تھا، اور اب جرمنی کے شہر ہائیڈل برگ میں موجود ہیں، یہ کتاب وہت کے نواسے عبدالمنعم کی روایت ہے، جو محدثین کے نزدیک کذّاب ہے۔

ڈاکٹر پروفیسر محمد مصطفی اعظمی نے حضرت عروہ کی سیرت سے متعلقہ روایات جمع کی ہیں، جو ابو اسود کی روایت سے ہیں، انہوں نے یہ کتاب ''**مغازی رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم لعروۃ بن الزبیر بروایۃ أبی الأسود یتیم عروۃ**'' کے عنوان سے شائع کی ہے۔

دوسرے طبقے کے سیرت نگاروں میں عبداللہ بن ابی بکر، عاصم اور زہری رحمہ اللہ بہت مشہور ہیں، ان کی کتابیں بھی ہم تک نہیں پہنچیں، تاہم ان کے بعد آنے والے مؤرخین کی کتابوں میں ان کی روایات بکثرت ملتی ہیں، دکتور سہیل زکار نے ان کتابوں سے امام زُہری کی مرویات ''**المغازی النبویۃ**'' کے عنوان سے جمع کر کے شائع کردی ہیں۔

تیسرے طبقے کے سیرت نگاروں میں سے زیادہ مشہور موسیٰ بن عقبہ، معمر بن راشد اور محمد ابن اسحاق رحمہم اللہ ہیں، یہ تینوں امام زہری رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں، ان کے علاوہ فزاری، ولید، واقدی، عبدالرزاق، مصیصی ، ابن سعد، وراق، ابن عائذ ، ابن ابی شیبہ، سلیمان بن طرخان، ہشام بن عمار اور یحییٰ بن سعید اموی بھی اسی طبقے کے مشہور سیرت نگار ہیں، اس طبقے کی اکثر کتابیں یا بعض حالتوں میں ان کے کچھ اجزاء ہم تک پہنچے ہیں، مثلاً: مغازی

موسیٰ بن عقبہ کے کچھ حصے مشہور مستشرق ایڈورڈ سخاؤ نے جرمن ترجمے کے ساتھ ۱۹۰۴ء میں شائع کیے ہیں؛ اسی طرح سیرت ابن اسحاق کے بھی کچھ اجزاء ہم تک پہنچے ہیں، زیادہ مشہور اور اہم حصہ وہ ہے جو سیرت ابن ہشام کے نام سے معروف ہے، سیرت ابنِ اسحاق کا وہ حصہ جو ''سیر و مغازی'' کے نام سے پایا گیا ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکا ہے، یہی حصہ دوبارہ دکتور سہیل زکار کی تحقیق کے ساتھ بھی شائع ہوا۔

فزاری کی ''سیرۃ الرسول'' کے دو اجزاء مراکش کی قرویین یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہیں۔...... واقدی کی کتاب ''مغازی'' مشہور مستشرق مارسن جونز کی تحقیق سے تین جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

امام عبدالرزاق کی کتاب ''السیرۃ'' ان کی مشہور کتاب ''مصنف عبدالرزاق'' کے ضمن میں ہم تک پہنچی ہے، جو مدت ہوئی شائع ہو چکی ہے، ابن سعد کی ''طبقاتِ کبریٰ'' سات جلدوں میں چھپی ہے اور عام ملتی ہے، اس کی پہلی اور دوسری جلد سیرتِ نبوی کے بارے میں ہے، جس کی اکثر روایات انہوں نے اپنے استاد واقدی کی سند سے بیان کی ہیں، ابن سعد نے ۱۴۳۳/مقامات پر واقدی سے روایت کی ہے۔ ابن عائذ کی کتاب بھی لندن میوزیم میں ہے اور مخطوطے کی صورت میں محفوظ ہے۔ امام ابن ابی شیبہ کی کتاب مخطوطے کی شکل میں ہے، اس کا ایک نسخہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں بھی موجود ہے۔...... یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جن مؤرخین نے سیرت نگاروں کے یہ طبقے بنائے ہیں، انہوں نے بہت سے سیرت نگاروں کو قلم بند نہیں کیا اور طبقات میں انہیں ان کی علمی حیثیت کے مطابق جگہ نہیں دی۔ (سیرتِ نبوی ﷺ: ۱/ ۳۳ تا ۴۲، حذفاً واختصاراً)

حرمین شریفین کے بارے میں تاریخی کتابیں:

بعض مؤرخین نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی تاریخ کے سلسلے میں الگ کتابیں لکھی ہیں، اُن کتابوں میں اِن دونوں شہروں سے متعلقہ قبل از اسلام اور بعد از اسلام کے حالات و واقعات نقل کیے ہیں، اس بارے میں سب سے اہم کتاب ابوالولید محمد بن عبداللہ ازرقی رحمہ اللہ کی ''اخبار مکۃ'' ہے، نیز ایک اہم کتاب، ابن نجار ابو عبداللہ محمد بن حسن ہبۃ اللہ بغدادی کی ''تاریخ مکۃ و ما جاء فیھا من الآثار'' ہے، ان کی ایک دوسری کتاب ''الدرۃ الثمینۃ فی أخبار المدینۃ'' صالح محمد جمال نے پوری تحقیق کے ساتھ ۱۹۶۶ء میں مکہ مکرمہ سے ''أخبار مدینۃ الرسول'' کے زیر عنوان شائع کر دی تھی، ایک غیر مطبوعہ کتاب فاکہی (وفات ۲۸۰ھ) کی ''اخبار مکۃ'' ہے؛ فاکہی نے ازرقی کی تاریخ پر جو اضافے کیے وہ مستشرق ویسٹن فیلڈ نے شائع کیے ہیں، اس کے علاوہ ابن زبالہ (متوفی قبل از ۲۰۰ھ) کی ''تاریخ المدینۃ''، ابن بکار (متوفی ۲۵۶ھ) کی ''تاریخ المدینۃ''

اورعمر بن شبّہ (متوفی ۲۶۲ھ) کی "تاریخ المدینة" بھی اچھی کتابیں ہیں۔آخر الذکر کتاب مدینہ منورہ کے ناظم اوقاف سید حبیب محمود احمد نے فہیم شلتوت کی تحقیق کے ساتھ ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء میں شائع کردی تھی، اس کتاب میں سیرتِ نبوی کے حوالے سے وسیع معلومات ملتی ہیں، محمد بن احمد فاسی (متوفی ۸۳۲ھ) کی کتاب "شِفَاء الغَرَام بأخبَار بَلد اللہ الحَرَام" بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کتاب ہے، دکتور عمر عبد السلام تدمُری نے ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء میں دو جلدوں میں اس کتاب کی تحقیق کردی تھی، فاسی کی ایک کتاب بنام "العقد الثمین فی تاریخ البلد الأمین" بھی ہے۔(مصادر السیرة النبویة للدکتور فاروق حمادہ:ص/ ۸۷،۹۷)،"وفَاء الوفَا بأخبَار دَار المُصطَفٰی" جو سمہودی (متوفی ۹۲۲ھ) کی تالیف ہے، یہ کتاب محمد محی الدین عبدالحمید کی تحقیق کے ساتھ تین جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

ان تالیفات سے استفادہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ان کی روایات کی تحقیق کر کے صحیح اور ضعیف کی پہچان کرلی جائے تاکہ عقائد واحکام کے بارے میں صرف صحیح روایات سے استدلال کیا جائے، اوصاف وآثار اورنقشوں کے لیے ضعیف روایات بھی قابلِ اعتماد ہیں، تاہم یہ صراحت کرنا ضروری ہے کہ روایت ضعیف ہے۔

عام تاریخی کتابیں:

ان کتابوں میں ہر قسم کی تاریخ بیان ہوتی ہے، چاہے اس کا تعلق کسی قوم، حکومت یا کسی فرد سے ہو اور چاہے وہ قبل از اسلام کی ہو یا بعد کی، ان کتابوں کی ابتدا عموماً "بدء الخلق" (مخلوق کی ابتدا) سے ہوتی ہے، یہ تاریخی کتابیں بہت زیادہ ہیں، ان میں سے اہم کتابیں یہ ہیں:

ﷺ تاریخ الامم والرسل والملوک:

یہ کتاب ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) کی لکھی ہوئی ہے، اور "تاریخ طبری" کے نام سے مشہور ہے، تاریخی روایات کے متعلق طبری کی معلومات نہایت وسیع تھیں، وہ محدث بھی تھے، انہوں نے اپنی اس تاریخ میں سیرتِ طیبہ کا بڑا ذخیرہ جمع کردیا ہے، تاہم ان میں ایک خامی ہے کہ وہ صحیح، ضعیف اور غیر معتبر ہر قسم کی روایات بیان کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب اسلام کا چہرہ بگاڑنے والے گمراہ لوگوں کے لیے بڑی "مرغوب دستاویز" رہی ہے، کیوں کہ وہ اسی کتاب کی غیر معتبر روایات بطورِ حجت پیش کرتے اور طبری کو اپنا ہتھیار بنالیتے ہیں، چناں چہ اس کتاب کی روایات کی چھان بین تنقیدِ حدیث کے اصولوں کی روشنی میں ہونی چاہیے۔ دوسری کمزوری یہ ہے کہ وہ ضعیف وغیر معتبر روایات کی وضاحت بھی نہیں کرتے، بلکہ بیان کر کے خاموشی سے آگے بڑھ جاتے

ہیں، اس وصف میں اکثر مؤرخین ان کے ساتھ شریک ہیں، کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ جب ہم نے سند بیان کردی تو ہم پر کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہی، اور سند پر غور کرنا قاری کا کام ہے، طبری اپنی تاریخ کے مقدمے میں خود لکھتے ہیں:

''اگر میری کتاب میں کوئی ایسی روایت نظر آئے جسے قاری قبیح یا نامناسب خیال کرتا ہو، یا اسے درست نہ سمجھتا ہو، تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں بلکہ کوتاہی ہوگی تو اس شخص کی جس نے وہ بات ہم تک پہنچائی، ہم نے تو صرف یہ کیا ہے کہ اس کی پہنچائی ہوئی بات من وعن نقل کردی ہے''۔ (تاریخ الطبری: ۱/ ۸)

یہاں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ امام طبری بذاتِ خود ثقہ اور معتبر شخصیت ہیں۔

ﷺ تاریخ خلیفہ بن خیاط:

خلیفہ بن خیاط عصفری (متوفی ۲۴۰ھ) نے اپنی کتاب کو سن وار مرتب کیا ہے، انہوں نے آغاز نگارش اس امر کی وضاحت سے کیا ہے کہ ہجری تاریخ کی ابتدا کیسے ہوئی، پھر انہوں نے تقریباً ۵۰ رصفحات میں اختصار کے ساتھ سیرتِ نبوی کے واقعات تحریر کیے ہیں۔ ان واقعات کے بارے میں انہوں نے دراصل امام محمد بن اسحاق پر اعتماد کیا ہے، اور ان کے دو معتبر شاگردوں بکر بن سلیمان اور وہب بن جریر بن حازم کی روایت سے نقل واستفادہ کیا ہے، اس فصل میں سیرتِ طیبہ سے متعلقہ تمام اہم واقعات اختصار کے ساتھ آگئے ہیں، انہوں نے ابن اسحاق کی روایات مختصراً بیان کی ہیں، اس طرح تفصیل واطناب کے بغیر سیرت کا ایک مستحکم قالب پیش کردیا ہے۔

چوں کہ خلیفہ عصفری ثقہ اور معتبر محدث ہیں، امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اپنی صحیح بخاری اور دیگر تالیفات میں ان سے روایات نقل کی ہیں، اس لیے اس کے اثرات بھی ان کی تاریخ میں صاف جھلکتے نظر آتے ہیں، خصوصاً سیرت کے متعلقہ روایات انہوں نے مؤقر ومعتبر محدث اساتذہ کے حوالے سے بیان کی ہیں، مثلاً: ابن عیینہ، یزید بن زریع، غندر اور اسماعیل بن علیہ، اور یہ بہت اعلیٰ درجے کی صحیح اور ثقہ روایات ہیں۔ [مصادر السیرۃ النبویۃ للدکتور فاروق حمادہ: ص/ ۸۱، ومقدمۃ التحقیق لتاریخ خلیفہ بن خیاط للدکتور العمری: ص/ ۵-۱۸] حافظ ابن حجر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''بہت سچے (صدوق) اور کھرے انسان تھے، گاہے گاہے بھول چوک ہوجاتی تھی، مؤرخ تھے۔''

[تقریب التہذیب: ۱/ ۲۷۳]

دیگر تاریخی کتابیں:

عمومی تاریخ کی دیگر اہم کتابیں یہ ہیں:

ﷺ ابن طاہر مقدسی (متوفی ۳۵۵ھ) کی کتاب "البدءو التاریخ"۔

ﷺ احمد بن یحییٰ بلاذری (متوفی ۲۷۹ھ) کی "فتوح البلدان"۔ اس کتاب میں صحیح اسناد بکثرت موجود ہیں، اس کا خصوصی امتیاز معاہدے اور عہد نامے ہیں، جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے عہد مبارک میں تحریر کرائے اور وہ اس کتاب میں حرف بحرف نقل کردیئے گئے ہیں۔

ﷺ احمد بن جعفر بن وہب (متوفی ۲۹۲ھ) کی "تاریخ الیعقوبی" ہر چند انہوں نے اسناد بیان نہیں کیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کے خطبات کے نمونے بڑے اہتمام سے نقل کیے ہیں۔

ﷺ ابو الحسن علی بن حسن مسعودی (متوفی ۳۶۴ھ) کی کتابیں، مثلاً: "مروج الذهب" اور "التنبيه والإشراف"۔ موصوف نے ان کتابوں میں واقعات اجمالاً نقل کیے ہیں، اور اسناد بیان نہیں کیں، تاہم کہیں کہیں مؤرخین واقدی، ابوعبیدہ، معمر بن مثنیٰ اور ابوعبید قاسم بن سلام کے حوالے دیئے ہیں۔

ﷺ ابوالقاسم علی بن حسن بن عساکر (متوفی ۵۷۱ھ) کی "تاریخ دمشق الکبیر"۔ یہ اپنے دور کے بہت بڑے حافظ تھے، انہوں نے سیرتِ طیبہ سے متعلقہ بکثرت معتبر اور مستند روایات بیان کی ہیں۔

ﷺ ابن حبیب بغدادی (متوفی ۲۴۵ھ) کی "المحبّر"۔ انہوں نے اسناد بیان کرنے کا اہتمام نہیں کیا۔

ﷺ ابو یوسف یعقوب بن سفیان فسوی (متوفی ۲۷۷ھ) کی "المعرفة والتاريخ"۔

ﷺ ابن ابی خثیمہ ابوبکر احمد بن زہیر بن حرب (متوفی ۲۷۹ھ) کی "التاريخ الكبير"۔

ﷺ ابن قتیبہ دینوری (متوفی ۲۷۰ھ) کی "عيون الأخبار" اور "المعارف"۔

ﷺ احمد بن داؤد دینوری (متوفی ۲۸۲ھ) کی "الأخبار الطوال"۔

ﷺ حافظ ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) کی "تاريخ الإسلام"۔

ﷺ حافظ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) کی "البداية والنهاية"۔

یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ ان کتابوں میں صحیح، حسن اور دیگر ہر قسم کی ضعیف روایات بھی پائی جاتی ہیں، پس ضروری ہے کہ اسناد کی تحقیق کے بعد ہی ان پر اعتماد کیا جائے۔

(مصادر السیرۃ النبویۃ للدکتور فاروق حمادہ: ص/ ۸۲-۸۸)

ادبی کتابیں:

متقدمین نے وہ اشعار بڑے ذوق وشوق سے نقل کیے ہیں، جن میں تاریخی واقعات کی ترجمانی وتفسیر پائی جاتی ہے، ان میں ابن اسحاق اور ابن ہشام سرفہرست ہیں، یہاں تک کہ امام بخاری اور امام مسلم جیسے جلیل القدر ائمۂ حدیث نے بھی ایسے اشعار سے بے اعتنائی نہیں برتی، ہر چند ان کا مقصد صرف استشہاد کرنا ہے، ان اشعار کے کہنے والوں کا صحیح صحیح تعین بھی ایک قابلِ لحاظ امر ہے، ادب کی وہ نثری کتابیں جن میں رسول اللہ ﷺ کے اقوال وآثار حرف بحرف نقل کیے گئے ہیں، ان میں سے چند اہم کتابیں حسبِ ذیل ہیں:

ﷺ جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) کی کتابیں "البیان والتبیین" اور "الحیوان"۔ ان کتابوں کی کچھ نصوص صحیح ہیں اور کچھ وضعی۔

ﷺ عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) کی کتابیں "المعارف" اور "الشعر والشعراء"، امام ابن قتیبہ عظیم محدث تھے، قرآن کے بہت بڑے عالم تھے، بلند پایہ ادیب تھے، اصحابِ ستہ کے ہم عصر تھے اور انہی کے اساتذۂ کرام سے فیض یافتہ تھے۔

ﷺ محمد بن یزید کی کتاب "الکامل فی اللغۃ والأدب"۔

ﷺ ابوبکر محمد بن قاسم بن انباری (متوفی ۳۱۷ھ) کی کتابیں "الوقف والابتداء" اور "الادب"۔

ادب کی نہایت اہم کتابوں میں ابوالفرج علی بن حسین بن محمد قرشی اصفہانی (متوفی ۳۵۶ھ) کی "الأغانی" اور ابوعمر شہاب الدین احمد بن محمد بن عبدربہ بن حبیب قرطبی (متوفی ۳۲۷ھ) کی "العقد الفرید" شامل ہیں۔

"الاغانی" میں ابوالفرج نے عام روایات اسناد کے ساتھ بیان کی ہیں، اس لیے بہت سے شائقین علم صحتِ سند کی تحقیق کیے بغیر اس کی روایات سے مطمئن ہوجاتے ہیں، نتیجتاً یہ کتاب بدنیت مستشرقین اور ان سے متاثرہ مسلمان نوجوانوں کے لیے جو علمی تحقیق سے نابلد ہیں، حوالے کی من پسند کتاب بن چکی ہے۔

"الاغانی" اور اس کے مؤلف کے متعلق حقائق کے بارے میں متعدد تحقیقی مقالے چھپ چکے ہیں، جن میں اس خطرے کی نشاندہی کی گئی ہے کہ مبادا کوئی شخص اس کتاب یا اس کے مؤلف کو معتبر سمجھ لے، ان میں سے چند اہم مقالے ہیں، جو عربی زبان میں لکھے گئے ہیں:

ﷺ پروفیسر نذیر محمد مکتبی کا مقالہ "جولۃ فی آفاق الأغانی"۔ [البصائر: ۱۰/ ۷-۱۰۹]

ﷺ دکتور داؤد سلوم کا مقالہ بعنوان "شخصیۃ أبی الفرج الأدبیۃ والفکریۃ من خلال کتابہ" میں الاغانی کے ماخذوں، اسانید اور روایات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

شوقی ابو خلیل کا مقالہ جو انہوں نے اپنی کتاب "ہارون الرشید....." میں "من شوہ سیرۃ الرشید؟" کے عنوان سے صفحہ ۱۲۳ر سے ۱۳۳ر تک تحریر کیا ہے۔

دکتور زکی مبارک کی کتاب "النثر الفنی فی القرن الرابع الهجری" [ص:۲۸۸-۲۹۰]۔

انہوں نے ابو الفرج کی شخصیت پر کچھ بحث کی اور اس کے اخلاق وعادات بھی بتائے ہیں، اور اس کی کتاب کے اغراض ومقاصد کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے اس کی فکری گمراہیوں کی نشاندہی کی ہے کہ اگر چہ وہ عبقری شخص تھا مگر وہ عشق ومستی میں ایسا ڈوبا کہ اخلاق اور دین کی حدود سے باہر نکل گیا؛ پس یہ بہت خطرناک بات ہوگی کہ کوئی شائقِ علم یہ سمجھ بیٹھے کہ "الاغانی" کی روایات کسی تاریخی قدر وقیمت کی حامل ہیں، یا کوئی شخص ان روایات پر تاریخی حقائق کی بنیاد رکھ لے۔ ابن کثیر نے ابو الفرج کے متعلق ابن جوزی کی یہ رائے نقل کی ہے:

"ایسے شخص پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ وہ اپنی کتابوں میں عشق ومستی کی دعوت دیتا، شراب نوشی کو معمولی غلطی سمجھتا اور وہ خود اپنے عشق کی داستانیں بھی بیان کرتا ہے، جو بھی شخص اس کی کتاب کا بغور مطالعہ کرے گا وہ اس میں ہر قباحت اور مضرت پائے گا۔ اس نے محمد بن عبد اللہ بن بطیت اور بعض دوسرے لوگوں سے احادیث روایت کی ہے، امام دارقطنی وغیرہ نے اس سے بھی روایات لی ہیں۔" (البدایۃ والنہایۃ:۱۱/ ۲۹۴)

"العقد الفرید" میں سیرتِ طیبہ سے متعلقہ بہت مفید باتیں بھی پائی جاتی ہیں، دوسری ادبی کتابوں کی طرح اس کی بھی چھان بین کی جانی چاہیے۔

سیرتِ طیبہ کے مصادر وماخذ کے بارے میں آخری بات:

ان مؤلفین کے بعد جس نے بھی سیرتِ طیبہ کے بارے میں کوئی کتاب لکھی اس نے انہی کو بنیاد بنایا ہے، لہٰذا ہر محقق اور مؤلف کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کی روایات اور اسانید کی خوب چھان بین کر لے، پھر صحیح روایات سے استدلال کرے اور عقیدہ واحکام شرعیہ کے علاوہ دیگر موضوعات میں قدرے کمزور روایات پر بھی اعتماد کرے، البتہ نہایت کمزور روایات نظر انداز کر دے۔

مزید برآں وہ ان مراتب کی صراحت بھی کرے کہ کون سی روایت صحیح ہے، کون سی ضعیف اور کون سی غیر معتبر ہے، تاکہ قاری کی نظر سے کوئی چیز اوجھل نہ رہے، اور ہر چیز اس پر پوری طرح روشن ہو جائے، پھر اس کی مرضی ہے کہ وہ ہدایت پر رہے یا گمراہ ہو جائے۔

قدرے ضعیف روایت کرنا یا (عقیدہ اور احکام کے علاوہ) دیگر امور کے سلسلے میں ان پر اعتماد کرنا خود ائمۂ حدیث سے صراحتاً ثابت ہے، ان محدثین کے سرخیل امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"جب ہم نبی کریم ﷺ سے فضائلِ اعمال یا کسی ایسے معاملے ہیں، جس کی بدولت کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا، یا منسوخ قرار نہیں پاتا، روایت کرتے ہیں، تو ہم اسانید کے معاملے میں نرمی برتتے ہیں"۔

(الکفایۃ فی علم الروایۃ: ص/ ۱۶۳، المقصد الأرشد فی ذکر أصحاب الإمام أحمد: ۳/ ۱۶۱)

امام ذہبی لکھتے ہیں:

''اکثر ائمۂ محدثین احکام کی احادیث میں سختی برتتے ہیں، مگر فضائل اور رقاق (ترغیب وترہیب اور زہد) کی احادیث میں مکمل طور پر تو نہیں، لیکن قدرے نرمی برتتے ہیں اور اس بارے میں ضعیف سند والی روایات بھی قبول کر لیتے ہیں، بشرطیکہ ان کے راویوں پر تہمتِ دروغ نہ ہو، کیوں کہ سراسر موضوع اور بہت کمزور روایات ناقابلِ التفات ہیں''۔ (سیر أعلام النبلاء:۸/۵۲۰)

ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

''بہت سے ائمۂ محدثین نے رقاق وغیرہ کی احادیث ضعیف راوی سے روایت کرنے کی اجازت دی ہے، ان میں امام عبدالرحمن بن مہدی اور امام احمد بن حنبل جیسے عظیم محدث بھی شامل ہے''۔

(شرح العلل للترمذي:۱/۷۳)

مندرجہ بالا کتابوں اور اس موضوع پر لکھی جانے والی دوسری کتابوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ان کی اسانید کی جانچ پرکھ ہی سے لگایا جاسکتا ہے، لہٰذا وہ کتابیں جن میں روایات کا درجہ بیان کر دیا گیا ہے، یا جن کتابوں میں صحیح روایات پر اعتماد کیا گیا ہے، وہی ہمارے نزدیک اہم اور ثقہ ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جب سیرتِ طیبہ کی وسیع معلومات صحیح اور معتبر کتابوں میں موجود ہیں، تو یہی کتابیں قابلِ اعتماد ہیں، صحیح اور مستند روایات کی موجودگی میں ضعیف روایات پر اعتماد کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

مشہور مقولہ ہے:

''کسی چیز کی اصل حقیقت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس کے مدِ مقابل سے آگہی کے بعد ہی ہوتا ہے''۔

(سیرتِ نبوی ﷺ:ص/ ۳۳ تا ۶۰ مختصراً)

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

سیرت نگاری کی تاریخ

اگر علم سیرت کی پوری تاریخ کا جائزہ لیا جائے، تو اندازہ ہوتا ہے کہ علم سیرت اب تک سات مختلف مدارج ومراحل سے گزرا ہے، اور اب آٹھویں مرحلہ یا آٹھویں درجہ میں داخلہ کے لیے تیار ہے۔

تدوین سیرت کا سب سے پہلا مرحلہ معلومات اور ڈیٹا کی جمع اور فراہمی کا مسئلہ تھا، اس مرحلہ کا اصل اور بنیادی ہدف یہ تھا کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات بابرکات کے بارے میں تمام متعلقہ معلومات کو جمع کرلیا

جائے، ان کو ضائع ہونے یا فراموش ہونے سے محفوظ کرلیا جائے اور آئندہ آنے والی نسلوں تک اس کو پہنچا دیا جائے، اس مرحلہ کے دو حصے تھے، ایک حصہ تو وہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور تکوینی حکم سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت سے بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سلسلہ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک جاری رہا، اسی پہلے مرحلے کے دوسرے حصہ کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے فوراً بعد شروع ہوا، اور جب تک صحابہ کرام اس دنیا میں موجود رہے، اس وقت تک یہ مرحلہ بھی موجود رہا، آخری صحابی کا انتقال کب ہوا، اس کے بارے میں محدثین میں تھوڑا سا اختلاف ہے، عام طور پر محدثین کا اتفاق ہے کہ ۱۰۵/ یا ۱۰۶/ ہجری میں آخری صحابی دنیا سے رخصت ہو گئے، اس کے بعد صحابہ کرام کے ذریعہ آنے والی معلومات کا راستہ بن ہو گیا۔

پھر تدوین سیرت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا، اس کو ہم دورِ تدوین وترتیب کہہ سکتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ذریعے جو معلومات آئی تھیں، اور پہلے سے جو معلومات حضور ﷺ کے خاندان، جغرافیہ عرب اور آپ ﷺ کے قبیلے اور برادری کے بارے میں دستیاب تھیں، ان سب کو اس طرح سے موضوع وار مرتب کرنے کا کام کرلیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا وہ نقشہ مکمل طور پر دنیا کے سامنے آجائے، جو آج ہمارے سامنے ہے، تدوین وترتیب کا یہ مرحلہ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں مکمل ہوا، اندازاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مرحلہ ۲۱۰/ ہجری کے لگ بھگ ختم ہو گیا، محدثین نے تابعین کا آخری زمانہ ۱۷۰/ اور ۱۷۵/ کے قریب قرار دیا ہے، اور تبع تابعین کا آخری دور ۲۱۰/ اور ۲۱۵/ ہجری کے قریب قرار دیا ہے، گویا ۲۱۰/ اور ۲۱۵/ ہجری کے درمیان یہ مرحلہ بھی ختم ہو گیا، جو جو مجموعے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے ہاتھوں مرتب ہونے تھے، وہ اس دور میں مرتب ہو گئے، وہ سارا ذخیرۂ معلومات محفوظ ہو گیا، اب اس وقیع اور قیمتی ذخیرۂ معلومات کے ضائع ہونے کا خدشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

تیسرا دور جس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تصنیف وتالیف کا دور ہے، یہ سن ۲۰۰/ ہجری کے لگ بھگ شروع ہوا اور کم وبیش اگلے ۲۰۰/ سال تک جاری رہا، ۴۰۰/ ہجری تک یہ مرحلہ بھی تقریباً مکمل ہو گیا، اس دور میں پہلے دونوں ادوار، بالخصوص دوسرے دور سے آنے والے تمام چھوٹے بڑے مجموعوں کو جمع کر کے مفصل اور مکمل کتابیں تیار کی گئیں، سیرت کو ایک باقاعدہ علم کے طور پر منظم اور مرتب کیا گیا، اور وہ ذخیرہ ہم تک پہنچ گیا۔

اس دور کی سب سے پہلی اور سب سے اہم کتاب جو انتہائی قبال ذکر ہے، وہ علامہ عبدالملک بن ہشام کی کتاب کا وہ نسخہ ہے جو انہوں نے ابن اسحاق کے کام کی بنیاد پر تیار کیا، یہ تیسری صدی ہجری کے آغاز کا کام ہے، ترتیب وتدوین کا یہ مرحلہ اگلے دوسو سال تک جاری رہا۔

چوتھا مرحلہ جس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سن ۴۰۰ سے شروع ہوا، اور آئندہ مزید دوسو سال تک جاری رہا، اس کو مرحلۂ استیعاب واستقصاء کہہ سکتے ہیں، یعنی سیرت سے متعلق تمام بلا واسطہ معلومات کا مکمل سروے اور استیعاب واستقصاء۔ واضح رہے کہ سیرت کے بارے میں علم حدیث اور سیرت کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی بہت سی قیمتی معلومات موجود تھیں، مختلف علوم وفنون میں منتشر طور پر یہ معلومات موجود تھیں، کچھ معلومات علم تفسیر میں تھیں، کچھ علم حدیث میں تھیں، کچھ مؤرخین مرتب کررہے تھے، کچھ معلومات لغت نویس مرتب کررہے تھے، کچھ معلومات جغرافیہ نویسوں کے پاس تھیں، ان سب کو جمع کرکے اور پچھلے دوادوار میں مرتب کردہ سیرت کے چھوٹے مجموعوں میں دستیاب مواد کو ازسرِ نو کھنگال کر بڑے بڑے مجموعوں کی شکل میں مرتب کیا گیا، یہ دور سیرتِ مبارکہ پر بڑی بڑی کتابوں کا دور ہے، اس دور میں چھ چھ، آٹھ آٹھ اور دس دس جلدوں پر مشتمل ضخیم اور جامع کتابیں لکھی گئیں، جن میں بہت سی کتابیں آج ہمارے مطبوعہ اور بعض مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں۔

پانچواں دور جس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تقریباً ۶۰۰ر ہجری کے لگ بھگ شروع ہوا، اور آج سے کم وبیش ڈیڑھ سو سال پہلے تک جاری رہا، یہ تجزیہ، مطالعہ اور تشعیب یعنی diversification کا زمانہ ہے، اس دور میں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ مطالعے سامنے آئے، کُتّاب النبی، وثائق النبی، رسول اللہ ﷺ کے دور کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں، مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے بارے میں، صحابہ کرام کے الگ الگ طبقات اور مجموعوں پر سارا کام تقریباً اسی دور میں ہوا، سیرت کے بارے میں دستیاب تمام معلومات اور جزئیات کو اہل علم، محدثین اور سیرت نگاروں نے اس طرح منقح کردیا کہ ایک ایک پہلو الگ الگ ہمارے سامنے آگیا۔

چھٹا دور انیسویں صدی کے نصف دوم میں شروع ہوا، تقریباً ۱۲۸۰ء کے لگ بھگ، ہم کہہ سکتے ہیں کہ علوم سیرت میں تجدید کا زمانہ آیا، سیرت پر ایک نئے انداز میں غور شروع ہوا، یہ وہ زمانہ ہے کہ سیرت کے بارے میں مغربی دانشوروں نے وسیع پیمانہ پر زور وشور سے اظہار خیال کیا، بہت سے سوالات ایسے اٹھائے جو پہلے گزرے ہوئے مسلمان سیرت نگاروں کے سامنے نہیں تھے، اس لیے کہ وہ ایک دوسرے انداز سے سیرت پر کام کررہے تھے، جو شخص اپنا سمجھ کر سیرت پر کام کرے گا اس کا انداز اور ہوگا، جو پرائی نظر سے دیکھے گا اس کا انداز اور ہوگا، جو مسلمانوں کے اندر بیٹھ کر لکھے گا اس کا انداز مختلف ہوگا، اور جو باہر سے دیکھ کر لکھے گا اس کا انداز دوسرا ہوگا،

پھر موافقانہ اور مخالفانہ نظروں سے دیکھنے سے فرق پیدا ہوجاتا ہے، بدنیتی سے دیکھنے والا اور طرح کے سوالات اٹھائے گا، نیک نیتی سے مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں اور طرح کے سوالات پیدا ہوں گے، جو محبت اور عقیدت کی نظر سے دیکھے گا اس کی کیفیت ہی اور ہوگی، اور جو دشمنی کی نظر سے دیکھے گا اور کمزوریوں کی تلاش میں مطالعہ کرے گا وہ اور طرح کے مسائل میں الجھ جائے گا، ان اسباب کی بنا پر مغربی مصنّفین نے بہت سے سوالات اٹھائے، بعض سوالات حقیقی تھے اور بظاہر علمی انداز کے تھے، ایسے سوالات کا جواب سیرت نگاروں، محدثین اور اہل علم نے دیا اور سیرت کے فن کو ایک نئی جہت یعنی Dimension سے روشناس کیا، ان نئی نئی جہتوں کے ساتھ ساتھ مغربی اہلِ علم کی طرف سے بہت سے اعتراضات بھی کئے گئے اور شبہات کا بھی اظہار کیا گیا، جن کا مسلمان محققین اور سیرت نگاروں کی طرف سے جواب دینے کی کوشش کی گئی۔

انسان کا مزاج یہ ہے کہ جب تک اس کے سامنے کوئی شبہ یا سوال پیش نہ کیا جائے، بہت سی سادہ حقیقتوں پر بھی وہ غور نہیں کر پاتا، بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ یا تاریخ کا کوئی حادثہ سامنے ہوتا ہے، مؤرخین اس کو بیان کرتے رہتے ہیں، بہت بعد میں کہیں جا کر لوگ اس پر کوئی خاص سوال اٹھاتے ہیں، تو پھر اس کے جواب پر غور شروع ہوتا ہے، اور دستیاب مواد کی روشنی میں اس کا جواب تلاش کرلیا جاتا ہے، اسی طرح سے تجدید سیرت کے اس دور میں مغربی مستشرقین نے بہت سے سوالات اٹھائے، ان سوالات کی روشنی میں سیرت کے علم کو ایک نئی جہت دینے میں بڑی مدد ملی۔

دورِ حاضر کا آغاز کب سے ہوا، یہ تعین کرنا بڑا دشوار ہے، دراصل دورِ حاضر کوئی حقیقی چیز نہیں ہے، جس کو زمانۂ موجود کہتے ہیں وہ ایک غیر حقیقی چیز ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، زمانہ یا ماضی ہوتا ہے یا مستقبل ہوتا ہے، حال سے مراد وہ باریک فرضی خط ہے جو ماضی کو مستقبل سے جدا کرتا ہے، ایک لمحہ پہلے کی چیز ماضی ہے اور ایک لمحہ بعد آنے والا وقت مستقبل ہے، ان کے درمیان جو باریک فرضی خط ہے وہ حال ہے، اس لیے زمانہ حال جس کو کہتے ہیں وہ محض ایک مجازی بات ہے، اس میں ماضی قریب اور مستقبل قریب کو ملا کر ایک فرضی اور عارضی چیز بنالی جاتی ہے، جس کو زمانہ حال کہا جاتا ہے، لہٰذا درحقیقت زمانہ حال کا کوئی وجود نہیں ہے، اس لیے زمانہ حال پر جب سیرت النبی کے حوالے سے بات کی جائے، تو ماضی قریب میں جو کچھ ہوا اور مستقبل قریب میں جو کچھ ہونے کی امید ہے، اس کو زمانہ حال سے تعبیر کردیا جاتا ہے۔

یہ ادوار بہت ہی متعین اور حتمی طور پر طے شدہ نہیں ہیں، ان میں خاصا تداخل پایا جاتا ہے، یہ کہنا کہ فلاں دور 200 میں ختم ہوگیا اور فلاں دور 600 میں ختم ہوگیا، یہ شاید قطعیت کے ساتھ درست نہ ہوگا، 200ھ سے

کچھ معاملات آگے جا چکے ہوں گے، بعض موضوعات کے اعتبار سے یہ دور سنہ ڈیڑھ سو ہجری سے شروع ہوا ہوگا، بعض موضوعات کے اعتبار سے یہ 210 میں شروع ہوا ہوگا، لیکن ایک عمومی اندازہ کرنے کے لیے یہ حد بندیاں مفید ثابت ہوتی ہیں۔

اپنے اکابر اور اپنے اسلاف کے کارناموں میں دلچسپی لینا اور ان کو محفوظ رکھنا، خاص طور پر آئندہ نسلوں میں اعتماد پیدا کرنا عرب میں ایک طویل عرصہ سے مروج تھا، یہ وہ چیز تھی، جس کو ایام العرب کہتے تھے، ہر عرب قبیلہ اس طرح کے ایام سے متعلق اپنے آباء واجداد کے کارناموں اور ان کی یادداشتوں کو محفوظ رکھتا تھا، ہر بڑے بڑے قبیلے کے ایام مشہور ہیں، ربیعہ کے ایام مشہور ہیں، مضریوں کے بہت سے ایام مشہور ہیں، شمال اور جنوب، مشرق اور مغرب کے بڑے بڑے قبائل کے مشہور واقعات اور ایام کی تفصیلات عربی ادب میں اور تاریخ کی قدیم کتابوں میں موجود ہیں، جہاں ہر قبیلہ اپنی کامیابیوں کی تفصیلات محفوظ رکھتا تھا اور بیان کرتا تھا، وہاں ان کارناموں کے دوران یا ان پر تبصرہ کرنے کے لیے جو شعر اور قصائد کہے گئے، وہ بھی ان کا حصہ تھے اور وہ بھی محفوظ رکھے جاتے تھے؛ اسی طرح دوسرے قبائل کی شکست اور ناکامیوں کی تفصیلات بھی محفوظ رکھی جاتی تھیں تاکہ آئندہ اس قبیلہ کے خلاف اقدام کرنے میں ان سے مدد ملے، جو کردار آج صحافت ادا کرتی ہے کہ جس کو اٹھانا ہو اس کو اٹھاتی ہے اور جس کو گرانا ہو اس کو گرا سکتی ہے، ذرائعِ ابلاغ جس کو شہرت دینا چاہتے ہوں ان کو شہرت ملتی ہے اور جن کے بارے میں منفی رائے قائم کروانی ہو، تو ان کے بارے میں ذرائع ابلاغ منفی رائے بھی قائم کرا سکتے ہیں، اس زمانے میں بڑی حد تک یہ کردار شاعر ادا کرتے تھے، ہر بڑے قبیلے کا ایک شاعر ہوتا تھا، اس قبیلے کے ایام اس کے شاعر کی زبان سے قصائد کی صورت میں ادا ہوتے تھے، قبیلے کا بچہ بچہ ان قصائد کو یاد رکھتا تھا، اور وہ قصائد ہر فخریہ موقع پر بیان کئے جاتے تھے۔

اسی طرح سے صحابۂ کرام ؓ نے اس رواج اور طریقہ کو سامنے رکھتے ہوئے جس کو ہم "ایام النبی" کہہ سکتے ہیں، یا "ایام الرسول"، اس کے بارے میں جو قصائد لکھے تھے وہ سب کے سب سیرت نگاروں نے محفوظ رکھے ہیں، سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ شاعر دربارِ رسالت کہلاتے ہیں، ان کے قصائد ہیں، حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی اچھے شاعر تھے، ان کے قصائد ہیں، حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی نامور شعراء میں شمار ہوتے تھے، ان کے قصائد ہیں، اسی طرح جو صحابہ شاعر نہیں تھے، وہ بھی کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے، ان سب کے شعر محفوظ ہیں اور قدیم کتبِ سیرت میں بیان ہوئے ہیں۔

ایسے شعراء بھی تھے جو پہلے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھے، اور بعد میں قبول اسلام کی

سعادت سے بہرہ وَر ہوئے اور حمایت میں سامنے آئے، ان کے دونوں ادوار کے نمونے محفوظ ہیں، حضرت کعب بن زُہیر جو اپنے مشہور قصیدہ ''قصیدۂ بانت سعادُ'' کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں، ان کے پہلے دور کا کلام معروف اور مشہور ہے، دوسرے دور کا کلام بھی محفوظ اور مشہور ہے، مشہور شاعر اور قبائلی سردار ابوسفیان بن الحارث رضی اللہ عنہ جن کا تذکرہ کتب حدیث میں بہت آتا ہے، ان کا کلام بھی محفوظ ہے (بہت سے طلبہ ان کو ابوسفیان بن حرب، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد سے خلط ملط کردیتے ہیں)، یہ ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی تھے، بچپن میں حضور کے انتہائی قریبی دوستوں اور ساتھیوں میں تھے، رسول اللہ ﷺ سے بہت محبت تھی، لیکن اعلانِ نبوت کے بعد کسی وجہ سے پیغام کو قبول نہیں کرپائے، مخالفت میں بہت دور چلے گئے اور زبانی، جسمانی، مالی ہر طرح سے حضور ﷺ کی مخالفت کرنا شروع کردی، مخالفت میں جتنا کلام ابوسفیان کی زبان سے ادا ہوا، اتنا کلام شاید ہی کسی نے لکھا ہو، بعد میں ایک موقع پر فتح مکہ سے کچھ پہلے اسلام قبول کرلیا، اور پھر حضور ﷺ کی محبت اور عقیدت میں کسی اور صحابی سے پیچھے نہیں رہے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ جب غزوۂ حنین کے موقع پر مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، اور حضور ﷺ کے ساتھ چند ہی لوگ رہ سکے، ان میں سے ایک نام ابوسفیان کا بھی آتا ہے، وہ یہی ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب ہیں، اس موقع پر انہوں نے جس جاں نثاری سے حضور کا دفاع کیا، اس کے بارے میں کسی نے کہا، مجھے یاد نہیں کہ یہ حدیث ہے یا کسی صحابی کا قول ہے، لیکن اس موقع پر کہا گیا کہ ''ابوسفیان نے پچھلی ساری کسر پوری کردی''۔ یہ واقعات تھے جو صحابہ کرام نے سب سے پہلے محفوظ رکھے، جن صحابہ کرام کی زبان سے محفوظ ہوئے وہ شاعر بھی تھے، اور ماضی میں ایام العرب میں دلچسپی بھی لیا کرتے تھے۔ (محاضرات سیرت ﷺ: ص/ ۱۳۵ تا ۱۴۲)

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

سیرت نگاری کے مناہج و اسالیب

اس سلسلے میں ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم (جدت پسندی سے متأثر ہیں بلکہ مؤید وداعی گذرے ہیں البتہ مضمون سے ایسے مخدوش مواد کو حذف کیا گیا ہے پھر بھی اگر کوئی بات ہو تو نشاندہی کی گذارش ہے) کے مضمون سے

مقتبس تحریر یہ ہے:

جب ہم منہج یا Methodology کا ذکر کرتے ہیں، تو ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ سیرت کے سارے تحریری ذخائر کو متعین مناہج کے ذیل میں درجہ بند کیا جاسکے اور مناہج کی حد بندی میں لایا جاسکے گا، ہماری مراد صرف یہ ہے کہ سیرت نگاری میں جو شخصیات نمایاں رہی ہیں جن کا کام بہت غیر معمولی ہے، ان میں بڑے بڑے مناہج اور نمایاں اور قابلِ ذکر اسالیب کون کون سے تھے، کس انداز اور کس اسلوب سے بڑے بڑے لوگوں نے سیرت نگاری کی، ان اسالیب کی تعداد جتنی بھی ہو، کتنے ہی غور سے ان اسالیب کو وضع کیا جائے، کتنے ہی اہتمام اور دقتِ نظر سے ان مناہج کو متعین کیا جائے، پھر بھی سیرت لٹریچر کا بہت بڑا حصہ ایسا رہے گا جو مناہج و اسالیب کی ان حدود اور تعریفات سے باہر ہوگا، اس حصہ پر غور کر کے نئے اسالیب اور مناہج تجویز کرنے پڑیں گے، پھر بھی سیرت کا ایک ذخیرہ اس دائرے سے باہر رہے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مناہج اور اسالیب کا تعین جو بھی شخص کرے گا، وہ ایک فرد کرے یا بہت سے افراد کریں، وہ بہر حال محض چند افراد کی فہم و بصیرت کے مطابق موضوع کا احاطہ کرنے کی ایک کوشش ہوگی۔

سیرت کے دستیاب ذخیرہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے سیرت نگاری کے جو بڑے بڑے اسالیب ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہیں:

محدثانہ اسلوب:

اس اسلوب میں ان شخصیات نے سیرت پر زیادہ کام کیا جو دراصل حدیث کے متخصص تھے، اور ان کی عمر کا بیشتر حصہ اور وقت علم حدیث کے پڑھنے پڑھانے میں گزرا تھا، انہوں نے علم حدیث کے قواعد اور اصول کو سامنے رکھا، علم حدیث کے معیارات اور اصول وضوابط کے پیش نظر مواد کا انتخاب کیا، اس کو ترتیب دیا اور اس کے بعد سیرت کے واقعات و موضوعات کی ترتیب سے اس مواد کو مرتب کر کے جمع کر دیا، محدثین کی نظر میں سب سے بنیادی اور اصل چیز یہ ہے کہ جو چیز ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے منسوب کی جائے وہ ایک سو فیصد یقینی ہو اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس کی نسبت میں ذرہ برابر بھی کوئی تامل یا شک نہ کیا جاسکے، محدثین اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ جس راوی سے وہ روایت بیان کریں وہ براہِ راست انہوں نے اپنی زبان سے سنی ہو، نہ صرف سنی بلکہ سننے کی کیفیت معلوم اور واضح ہو، یہ کیفیت بھی محدثین بیان کرتے ہیں۔

اور حدیث کے آخر تک سارے مراحل میں یہی شرط پیش نظر ہوگی، پھر دیکھا جائے گا کہ جس نے بیان

کیا وہ کردار میں کیسا تھا؟ وہ انتہائی سچا انسان ہونا چاہیے، اس کے سچے اور کھرے انسان ہونے پر اتفاق رائے ہونا چاہیے، اس کی یادداشت محفوظ ہونی چاہیے، اس کے کردار اور شخصیت میں بلندی کا ایک خاص معیار ہونا چاہیے، اور اخیر تک، یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ تک یہ بات اسی طرح درجہ بہ درجہ نقل ہونی چاہیے، پھر جتنا لفظ جس راوی نے بولا ہے اس میں کسی ردوبدل کی گنجائش کا تصور بھی نہیں ہے، یہ محدثین کا معیار تھا...... کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو بات کہی جارہی ہے وہ سو فیصد اور سولہ آنے کھری ہونی چاہیے، یہ محدثین کا اسلوب تھا۔

محدثین میں جن حضرات نے سیرت نگاری کا کام کیا، ان میں تمام بڑے اکابر محدثین شامل ہیں، اس اعتبار سے کہ حدیث کے ہر مجموعے میں سیرت سے متعلق الگ الگ ابواب موجود ہیں، جہاد کے ابواب ہیں، مغازی کے ابواب ہیں، سیرت کے ابواب ہیں، رسول اللہ ﷺ کے خاندان اور ازواجِ مطہرات سے متعلق ابواب ہیں، صحابہ کرام کے بارے میں ابواب ہیں، ہجرت سے متعلق مباحث ہیں، یہ سارے مضامین محدثین نے مختلف ابواب کے تحت جمع کردیئے ہیں۔

مؤرخانہ اسلوب:

محدثانہ اسلوب کے بعد جو دوسرا اسلوب پیدا ہوا وہ مؤرخانہ اسلوب ہے، مؤرخانہ اسلوب کا آغاز تو بہت پہلے ہوگیا تھا، حتی کہ خود حضرت عروہ بن زبیر نے جب سیرت اور مغازی کے واقعات کو جمع کرنا شروع کیا تو سب سے پہلے انہوں نے یہ اسلوب اختیار کیا کہ وہ جب کسی واقعہ کے بارے میں معلومات جمع کرتے تھے تو ان ساری معلومات کو یکجا کرکے اور مرتب کرکے بیان کرتے تھے، چناں چہ عبدالملک بن مروان نے ان سے بہت سے سوالات پوچھے، ہجرت کا معاملہ ان سے دریافت کیا، حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی وفات کی تاریخ کے بارے میں معلوم کیا، ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کے بارے میں ان سے پوچھا، انہوں نے جو جوابات دیئے ان کا انداز یہ ہے کہ وہ لکھتے ہیں کہ آپ نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے، میرے پاس اس سلسلہ میں جو معلومات ہیں وہ فلاں راوی، فلاں، اور فلاں، یعنی آٹھ دس نام دے کر بتایا ہے کہ ان لوگوں سے مجھے یہ معلومات ملی ہیں، اور ان ساری معلومات کا خلاصہ یہ ہے، پھر وہ تمام مطلوبہ معلومات کو ایک مرتب اور متکامل انداز میں بیان کردیتے ہیں۔

آگے چل کر امت میں سیرت نگاری کے ضمن میں اس طرز کو قبولِ عام حاصل ہوگیا کہ ایک مرتب انداز میں اور ایک Systematic narrative کے انداز میں واقعات کو بیان کردیا جائے، یہ مؤرخانہ اسلوب تھا جس کے بانی حضرت عروہ بن زبیر کو قرار دیا جاسکتا ہے، اس اسلوب کو سب سے پہلے انہوں نے شروع کیا، پھر

دوسرے اصحاب مثلاً امام زہری نے، ابن اسحاق نے، پھر آگے چل کر واقدی اور ابن سعد نے اس اسلوب کو مزید پروان چڑھایا اور تیسری صدی ہجری تک یہ طرز بیان ایک معروف اور متعارف اسلوب بن گیا۔

مؤلفانہ اسلوب:

مؤرخانہ اسلوب کے نتیجہ میں سیرت پر پے در پے کتابیں آنی شروع ہوگئیں، جب یہ کتابیں بڑی تعداد میں آگئیں، تو پھر جلد ہی ایک تیسرا اسلوب سامنے آیا جس کو ہم مؤلفانہ اسلوب کہہ سکتے ہیں، مؤلفانہ اسلوب سے مراد یہ ہے کہ سیرت کے مختلف مآخذ اور کتب کو سامنے رکھ کر ایک تصنیفی انداز میں جس میں ایک مرتب، مربوط اور متکامل کتاب لکھی جاتی ہے، سیرت پر کتابیں تیار کی جائیں، اس طرح سے کتابیں لکھنے کا رواج تیسری صدی ہجری کے اواخر یا چوتھی صدی ہجری کے اوائل سے شروع ہوگیا، اس وقت سے لے کر آج تک سیرت کی جتنی کتابیں لکھی گئیں اور اب جتنی کتابیں لکھی جارہی ہیں، ان میں سے اکثر کتابوں کے اسلوب کو آپ مؤلفانہ اسلوب کہہ سکتے ہیں۔

فقیہانہ اسلوب:

اس کے ساتھ ساتھ سیرت نگاری کا ایک فقیہانہ اسلوب بھی تھا، فقیہانہ اسلوب سے مراد یہ ہے کہ سیرت کے واقعات پر اس انداز سے روشنی ڈالی جائے کہ ان سے کون سے فقہی احکام نکلتے ہیں، سیرت کے بہت سے واقعات، بالخصوص مغازی اور حضور ﷺ کی مہمات کی جو تفصیل ہے وہ اسلامی قوانین کا ماخذ بھی ہے، اور سنت کے بہت سے احکام بھی اس سے نکلتے ہیں، اس اعتبار سے کہ سیرت کے کون سے واقعہ سے سنت کا کون سا حکم نکلتا ہے، سیرت اور فقہ کی حدود مل جاتی ہیں، اس غرض کے لیے یعنی سنت کی تعیین کے لیے بعض جگہ سیرت کے واقعات کو بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ جب پہلی اور آخری مرتبہ حج کے لیے تشریف لے گئے، حضور ﷺ نے زندگی میں ایک ہی بار حج کیا، جب حج فرض ہوا تو آپ ﷺ نے گورنر مکہ حضرت عتاب بن اسید کو امیر حج مقرر فرمایا، دوسری مرتبہ جناب صدیق اکبر امیر حج کی حیثیت سے تشریف لے گئے، حضور ﷺ کی زندگی میں آخری سال جب حج کا موقع آیا تو آپ نے پہلی اور آخری بار حج فرمایا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اگر حضور ﷺ ایک سے زائد مرتبہ حج فرماتے تو ہر مسلمان کم سے کم دو حج کرنا چاہتا اور یہ ایک مشکل مسئلہ ہو جاتا، اس لیے حضور ﷺ نے ایک ہی حج پر اکتفا فرمایا۔

حضور ﷺ کے اس ایک حج کی تفصیلات بہت سے محدثین نے جمع کیں، صحابہ کرام نے بہت غور سے حضور ﷺ کے حج کو دیکھا، خود حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ "خُذُوْا عَنِّي مَنَاسِكَكُم" حج کے مناسک مجھ سیکھتے رہو۔ اس لیے صحابہ کرام ایک ایک چیز کو دیکھتے رہے اور اطاعت کرتے رہے، جن جن صحابہ کرام نے حضور علیہ

الصلوۃ والسلام کے اس حج کو دیکھا، انہوں نے جس انداز سے سمجھا اس کو بیان کر دیا، یہ دیکھنے والے کے فہم پر بھی مبنی ہے، دیکھنے والے نے کس حصہ کو دیکھا، کس حصہ کو زیادہ غور سے دیکھا، کس حصہ کو کم غور سے دیکھا، ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی خیمے میں آرام فرماتے رہے ہوں گے، کبھی وہ صحابہ جو دیکھ رہے ہوتے تھے وہ خود کسی ضرورت کی وجہ سے موجود نہ ہوتے ہوں گے، ہر وقت چوبیس گھنٹے پورے سفر میں تمام صحابہ تو نہیں دیکھتے رہے ہوں گے، حتیٰ کہ امہات المؤمنین کو بھی یہ موقع نہیں ملا ہوگا کہ چوبیس گھنٹے حضور کو دیکھتی رہی ہوں گی، اس لیے جس نے جتنا حصہ دیکھا اس کی بنیاد پر انہوں نے ایک رائے قائم کی، جب یہ سارا مواد بعد کے لوگوں کو ملا، اور اس سے حج کے تفصیلی احکام مرتب کیے جانے لگے، تو جس کو جس انداز سے معلومات ملی تھیں، اس نے اس انداز سے احکام کا استنباط کیا اور تفصیلات کو اسی انداز میں مدوّن کیا۔

مثلاً حج کی تین مشہور اقسام ہیں، حج اِفراد، حج قِران اور حج تمتع، یہ عجیب بات ہے کہ صحابہ کرام میں کچھ کا خیال تھا کہ حضور ﷺ نے حج افراد فرمایا، کچھ کا خیال تھا کہ حج قران فرمایا، اور کچھ کا خیال تھا کہ حج تمتع فرمایا، جن فقہاء نے اپنی تحقیق سے یہ رائے قائم کی کہ حضور ﷺ کا حج، حج قران تھا، جیسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، تو انہوں نے حج قران کو افضل قرار دیا، جن فقہاء کی تحقیق میں حضور ﷺ نے حج افراد فرمایا، جیسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، انہوں نے حج افراد کو افضل قرار دیا، جن کی تحقیق یہ تھی کہ حضور ﷺ نے حج تمتع فرمایا، تو انہوں نے حج تمتع کو افضل قرار دیا، جیسے امام شافعی رحمہ اللہ، اب یہ تحقیق کا اختلاف ہے، یہ سارے مباحث بیک وقت سیرت کے مباحث بھی ہیں، اس لیے کہ اس میں واقعاتی اعتبار سے حضور ﷺ کے حج کی تفصیلات سامنے آتی ہیں، یہ فقہی مسئلہ بھی ہے، حدیث کا مسئلہ بھی ہے، کیوں کہ حج کے احکام سے متعلق احادیث بھی اس میں زیر بحث آتی ہیں، یہ سیرت نگاری کا فقیہانہ اسلوب ہے۔

متکلمانہ اسلوب:

فقیہانہ اسلوب کے ساتھ ایک اور اسلوب بھی ہے جس کو ہم متکلمانہ اسلوب کہہ سکتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ علم کلام کے نقطۂ نظر سے رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کو دیکھا جائے اور جو چیزیں علم کلام کے نقطۂ نظر سے اہم ہیں وہ نمایاں کی جائیں، یہاں علم کلام سے مراد یہ گفتگو نہیں ہے جو ہم اور آپ دن رات کرتے ہیں، نہ اس سے مراد ادب کا کوئی شعبہ ہے، جیسا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ کلام ایک اصطلاحی لفظ ہے، جس کے معنی وہ علم یا فن ہے جس میں اسلامی عقائد کو عقلی دلائل سے بیان کیا جائے اور دوسرے مذاہب کے عقائد پر عقلی انداز سے تنقید کی جائے اور عقلی دلائل کی بنیاد پر اسلامی عقائد کی برتری ثابت کی جائے۔

یہ فن علم کلام کہلاتا ہے، اس کا رواج بھی سب سے پہلے محدثین کے ہاں ہوا، محدثین نے پہلے پہل وہ سوالات اٹھائے جن کا تعلق علم کلام سے تھا، علم کلام میں سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی عقلی دلیل کیا ہے؟ یہاں علم کلام کا تعلق سیرت کے ساتھ استوار ہوتا ہے، جب حضور ﷺ کی نبوت پر عقلی دلیل کا مسئلہ آیا تو پھر معجزات کی بحث آئی، پھر معجزات کی واقعاتی تفصیلات کو جمع کرنے کی بات ہوئی، پھر معجزات کی تعداد پر بحث ہوئی، اس طرح یہ مسئلہ سیرت کا ایک بہت مہتم بالشان مسئلہ بن گیا، گویا سیرت اور کلام کا ایک ایسا مشترکہ مضمون سامنے آیا جس کو ہم متکلمانہ سیرت کہہ سکتے ہیں، یا کلامیاتِ سیرت کہہ سکتے ہیں۔

ادیبانہ اسلوب:

سیرت کا ایک اور اسلوب جو بعد میں سامنے آیا اس کو ہم ادیبانہ اسلوبِ سیرت کہہ سکتے ہیں، یہ اسلوب بہت بعد میں سامنے آیا، سچی بات تو یہ ہے کہ محدثین اور مستند اربابِ سیرت کی بارگاہ میں اس اسلوب کو پذیرائی نہیں مل سکی، اور نہ مل سکتی تھی، جن حضرات نے آگے چل کر اس اسلوب کے تحت سیرت کی کتابیں لکھیں، اگر آج ائمۂ محدثین زندہ ہوتے تو شاید ان کے ساتھ بہت بری طرح پیش آتے، ادیبانہ اسلوب سے مراد یہ ہے کہ سیرت کے واقعات کو خالص ادبی اسلوب نظم یا نثر میں مرتب کیا جائے، دراصل جب سیرت کے واقعات مرتب ہو گئے، مستند قرار پاگئے اور لوگوں تک پہنچ گئے، تو بعض ادیب حضرات نے ان کو یا تو حکایت کے انداز میں یا نظم میں یا مکالمہ اور کہانی کے انداز میں بیان کیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ عامۃ الناس میں وہ لوگ جو سیرت پر سنجیدہ کتابیں نہیں پڑھنا چاہتے ان کے لیے سیرت کے مواد میں ایسی ادبی چاشنی اور رنگ پیدا کر دیا جائے کہ غیر متخصص بھی سیرت کا مطالعہ کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

یہ اسلوب سب سے پہلے فارسی میں پیدا ہوا، فارسی کے لٹریچر سے اردو میں آیا، عربی میں اس کا آغاز بہت بعد میں ہوا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس اسلوب پر زیادہ کتابیں بہت بعد میں اور زیادہ تر اردو اور فارسی میں لکھی گئیں تو یہ درست ہوگا، ادیبانہ اسلوب میں کچھ کتابیں نظم میں ہیں اور کچھ نثر میں بھی ہیں، نظم کا آغاز پہلے ہوا، نثر کا آغاز بعد میں ہوا، ویسے بھی ہر زبان کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ہر زبان میں نظم کا آغاز پہلے ہوتا ہے اور نثر کا بعد میں ہوتا ہے، عربی زبان میں بہت سے ادیبوں نے سیرت کے واقعات کو نظم کیا، ایک ایک ہزار شعروں پر مشتمل نظمیں لکھی گئیں، بلکہ دو دو اور تین تین ہزار اشعار پر مشتمل نظمیں اور قصائد ہیں جن میں حضور ﷺ کی زندگی کے واقعات کو بیان کیا گیا، کسی نے معجزات کو بیان کیا ہے، کسی نے بعض خاص غزوات کا ذکر کیا ہے۔

مناظرانہ اسلوب:

سیرت نگاری کا ایک اور اسلوب جو بہت بعد میں پیدا ہوا، وہ مناظرانہ اسلوب تھا، اس سے مراد وہ اسلوب تھا جو مسلمان مسالک یا مدارس فکر کے مابین مناظروں کی وجہ سے وجود میں آیا، ان مناظروں کے نتیجے میں مسلمانوں میں مختلف رائے رکھنے والے لوگوں نے سیرت کے مختلف واقعات کی تعبیر اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کی، اس تعبیر میں اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں دلائل دیئے اور دوسروں کے نقطۂ نظر پر تنقید کی، اس اسلوب پر تیسری چوتھی صدی ہجری کے بعد سے تھوڑا بہت کام تو ہر دور میں ہوتا رہا، لیکن زیادہ زور وشور سے برصغیر میں اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں یہ چیز سامنے آنا شروع ہوئی، یہ محض اتفاق نہیں ہے، ...... جب یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر کے بیشتر حصوں پر قبضہ کر کے حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی، تو پھر مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں یہ مسائل بھی پیدا ہونے لگے اور ایسے ایسے مسائل اور سوالات اٹھائے گئے جو پچھلے بارہ سو سال میں نہیں اٹھائے گئے تھے، ہر فریق نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں قرآن پاک سے بھی استدلال کیا، یہ عمل نسبتاً محدود تھا، سیرت اور حدیث سے استدلال کی نوبت زیادہ آئی، اس کے نتیجے میں ایک مناظرانہ ادب سامنے آیا جس کی علمی حیثیت کے بارے میں تو سر دست کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن وہ برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے، اس کا کم سے کم اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ مناظرہ اور بحث میں حصہ لینے والے تمام فریقوں کے پیروکاروں کے حلقوں میں سیرت کے بہت سے واقعات معلوم اور متعارف ہوگئے، سیرت کے جس واقعہ سے کسی خاص بزرگ نے استلال کیا تو کم سے کم ان کے ماننے والوں اور عقیدت مندوں میں وہ واقعات مشہور ومعروف ہوگئے، اس طرح بالواسطہ طور پر اس سارے مناظرانہ ہنگامہ کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ سیرت کا علم نسبتاً زیادہ عام ہوگیا۔

یہ ہیں سیرت کے وہ بڑے بڑے اسالیب ومناہج جو حضرت عروہ بن زبیر کے دور سے لے کر آج تک گزشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال میں ہمارے سامنے آئے۔ (محاضرات سیرت ﷺ: ص/ ۱۹۶ تا ۲۰۷، ملخصاً)

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

سیرت نگاری کے منحرف مناہج

بعثت نبوی ﷺ سے قبل پورا عالم ظلمت وتاریکی اور گمراہیوں کی گھٹا ٹوپ اندھیریوں میں تھا، شرک وفساد، جہالت والحاد، عناد وسرکشی کا ہر طرف دور دورہ تھا، ایسے وقت میں اُن کی ہدایت ورہنمائی اور دعوت الی اللہ کی خاطر، اللہ تبارک وتعالیٰ نے عرب وعجم کے لوگوں کی طرف آپ ﷺ کو رسول بنا کر مبعوث فرمایا، اور تا کہ آپ کے ذریعے کفر وشرک اور جہالت میں ڈوبے، راہِ ہدایت سے اندھے اور بہرے بنے ہوئے اور گناہوں کی دلدل سے

جن کے قلوب پر پردہ پڑ چکا تھا، انہیں دینِ حنیف (دینِ اسلام) کی طرف بلائے۔

سیرتِ نبوی ﷺ پر متقدمین ومتاخرین نے بہت کچھ لکھا، کیوں کہ یہ ایک وسیع میدان ہے، لیکن سیرت پر تمام محررین کی تحریرات صحیح ہوں ایسا ضروری نہیں، بہت سی ایسی تحریرات ہیں جو سیرت پر لکھی گئیں، مگر ان میں رطب ویابس سب کچھ جمع کر دیا گیا ہے، اور فرقِ ضالہ منحرفہ اس سلسلے میں بہت زیادہ خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں، مثلاً شیعہ، مستشرقین، سیکولر ذہنیت کے حامل افراد اور منحرف عن الدین اُدباء وغیرہ، بلکہ بہت سے اسلام دشمنوں نے تو سیرت کو موضوع ہی اس لیے بنایا تا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر بے جا و بے اصل طعن وتشنیع کر سکیں، جیسے ازدیادِ نکاح وغیرہ۔

بعض منحرف مناہج کا ذکر کرنے سے پہلے منہج کا معنی ومطلب سمجھ لینا ضروری ہے۔

منہج کا معنی ہے راستہ، طریق وسبیل، یعنی ایسا طریقہ اور راستہ جس سے ہمیں سیرت کے اُن مبادیات وتصورات کا پتہ چلتا ہے، جو اسلام نے وضع کیے، جیسے اگر کہا جائے: مطالعۂ سیرت میں اسلامی منہج وطریقۂ کار، تو اس کا مطلب ہوگا...... وہ مبادیات وتصورات جس کو اسلام نے وضع کیا ہے، جیسے حدود اور عام اصول جن کے مطابق سیرت اور اس کی تفسیر اس کے مبادیات وتصورات کی روشنی میں کی جاتی ہے، جو مبادی وتصورات مفاہیمِ اسلام سے نکلتے ہیں، یعنی ایسے اصول وضوابطِ عامہ جس کی مدد سے اُس فن کی صحیح معلومات پختہ ثبوت کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔

ایک مسلم ریسرچ اسکالر کے لیے منہج اسلامی کا التزام ضروری ہے، اور وہ اپنی تحریر کو عقیدۂ صحیحہ کی روشنی میں اور اس کے اصول وضوابط کو سامنے رکھ کر لکھے، عقیدے کی اسی اساس کے التزام کی بنیاد پر مؤرخین واسکالروں کے اعمال (طریقۂ کار) کا اندازہ لگایا جاتا ہے، اور ان کے مناہج ومذاہب فی التالیف کو جانچا جاتا ہے، اس لیے کہ مسلم اسکالر کو اپنے موقف کے اختیار حوادث وواقعات کی تفسیر وتقسیم میں مطلق آزادی حاصل نہیں ہوتی ہے کہ جو جی میں آئے لکھتا چلا جائے بلکہ وہ اصولِ علمیہ اور قواعدِ شرعیہ کا پابند ہوتا ہے، اس کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی راوی کو متہم قرار دے، جب تک کہ خود اس روایت کی صحت وعدالتِ رُواۃ اور اتصالِ سند کو تاکیداً نہ جانچ لیں۔

اس مجال (سیرتِ نبوی ﷺ) میں کلام، کلامِ ناس سے مختلف ہے، اس کے حدود وضوابط ہیں، جن کا جاننا ضروری حق اور واجب ہے، ایک مسلم وغیر مسلم لکھارے، مضمون نگار اور اسکالر کے مابین یہی فرق امتیاز ہے، ایک مسلم اسکالر جب تحریر لکھتا ہے، تو وحیٔ الٰہی، اصول وعقائد شرعیہ اسلامیہ کی روشنی میں لکھتا ہے، اور ایک غیر مسلم چوں کہ عدم معرفتِ خداوندی وحقیقتِ ربوبیت وعبودیت، انسان کے وظیفے، اس کی تخلیق کے مقصد سے عاری ہونے کی بنا پر ظنون اور اوہام کی پیروی کرتا ہے، اور رجم بالغیب یعنی اندھا دھند زبانی فائرنگ کرتا چلا جاتا ہے، اس کے پیشِ نظر نہ کوئی دلیل ہوتی ہے، نہ کوئی اصول، بس یونہی جو دل میں آیا لکھ دیا۔

اسی وجہ سے ان میں اکثر اختلاف ہوتا رہتا ہے، اور پھر وہ حقائقِ مطمئنہ تک بھی نہیں پہنچ پاتے، اور اسی اضطراب وحیرانی اور بے چینی وپریشانی کی حالت میں زندگی گزارتے ہیں، شک وخوف، گھبراہٹِ نفس اور تشتُّتِ ذہنی کا شکار رہتے ہیں، اور پھر یہ اَعراض واَمراض اُن کے مطالعے اور تحریر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

الغرض! خلاصہ اور ما حصل یہ ہے کہ ایک اسلامی اسکالر کو تاریخ اسلامی اور اس میں پیش آمدہ حوادث وواقعات سے مطلع رہنا ضروری ہے؛ تصورِ سلیم، عقیدۂ صحیحہ، علوم شرعیہ میں درایت وفقاہت اور مہارتِ تامہ کا ہونا بھی ضروری ہے؛ ورنہ تاریخ (خصوصاً سیرتِ نبوی ﷺ) ایک کھلونا بن کر رہ جائے گی۔

(ملخصاً از مضمون دکتور اکرم ضیاء العمری، السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ: ۱/ ۳۲-۳۸)

مغربی اور سیکولر اسکالر منہج سیرت میں انحراف:

مغربی مستشرقین وسیکولر اسکالروں نے سیرت پر جو تحریریں لکھیں اس کے مسلمانوں کے ذہنوں پر بہت سے اثرات مرتب ہوئے، انہوں نے سیرت النبیا کو اپنا مجال ومیدان بنایا، آپ ﷺ کی ذات بابرکات کو تنقید کا نشانہ بنایا، اسلام کی شبیہ بگاڑنے کی از حد کوشش کی اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات وحیاتِ طیبہ پر بہت سے بے جا اعتراضات کیے، اسلام کو شکوک وشبہات کے دائرہ میں لا کھڑا کیا، مگر ان کے یہ اعتراضات صدا بصحرا ثابت ہوئے۔

مغربی محرکین کون؟ من ھم دُعاۃ التغریب؟

مغربی مستشرقین سیکولر مذہبی مغرب کے اسکالر وہ حضرات ہیں جو مشنریوں اور صلیبی اداروں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کیے، اور مبشرین ومستشرقین کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، اُن کے نظریات سے حد درجہ متاثر ہوئے، اور پھر نہایت لگن اور اخلاص کے ساتھ انہی کے نظریات کے مطابق کام کرنے لگے، پھر یہی طلباء تکمیلِ تعلیم کے بعد جب اپنے ممالک اور شہروں کی طرف لوٹے تو علمی اداروں اور سیاسی عہدوں پر فائز ہوئے، انہوں نے اپنے اساتذہ کے نہج پر کام کرتے ہوئے ان کے نظریات کو مزید رواج دیا، ان کے افکار وتصورات کی دعوت عام کی، بلکہ حقیقتاً وہ مستشرقین سے بھی زیادہ غالی اور جری واقع ہوئے، جو دینِ اسلام جو کہ اَبدی اور دائمی دین ہے، کو مسلمانوں کے تعلیمی وسیاسی میدان میں تخلُّف یعنی پچھڑنے کا سبب گردانتے ہیں، اور اپنے محاضرات ومقالات اور مجالسوں میں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہمیں مغربی مفکرین حضرات کے شانہ بشانہ اور قدم بہ قدم چلنا ہے، اسی میں ہماری فلاح وکامرانی مضمر ہے۔

مغربیت زدہ حضرات دو طرح کے ہیں:

بعض تو وہ ہیں جو مسلم گھرانوں میں پیدا ہوئے، بلکہ ان میں سے بعض نے مدارسِ اسلامیہ اور اسلامی اسکولوں میں تعلیم حاصل کی، جیسے طٰہٰ حسین المصری۔

اوربعض وہ ہیں جو عرب نصاریٰ (عرب عیسائی) ہیں، ان طلباء اور اُن کے اساتذہ (مبشرین ومستشرقین) میں کوئی فرق نہیں، کیوں کہ اُن کا مذہب، مسلک ومشرب، ان کے اہداف وغایات اورعادات یکساں ہیں، بلکہ ان کے اسماء بھی باہم متشابہ ہیں، فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ تلامیذ عربی ماحول میں پلے بڑھے، اوراساتذہ یوروپین کلچراورایشیائی ماحول میں پروان چڑھے۔

یہی عرب نصاریٰ (عیسائی طلبہ) جب مستشرقین ومبشرین اساتذہ سے کسب تعلیم کرکے آتے ہیں، تو مدارس اور یونیورسٹیوں میں بحیثیت ٹیچر ومعلم مقرر ہوتے ہیں، اور پھر خصوصاً مسلمان طلباء اُن کی مغربیت زدہ ذہنیت کا شکار ہوتے ہیں، یہی اساتذہ مدارس میں اختلاط بین الجنسین کو ہوا دیتے ہیں، اور مسلم طلبہ کی برین واشنگ اس طرح کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہر میدان (خواہ علمی، سیاسی یا سماجی وغیرہ ہو) میں پچھڑ جانے اور پیچھے رہ جانے کا سبب صرف اور صرف تمسک بدین الاسلام (دین اسلام پر مکمل عمل) اور نبوت ورسالت محمدیہ ﷺ پر تمسک ہے، اور پھر یہی مسلم طلبہ بھی مغرب زدہ ذہنیت لے کر مسلمانوں میں اُن کے افکار وتصورات اور نظریات کو شائع اور عام کرتے ہیں، اور اسلام کی مضبوط ومستحکم دیوار میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔

مغرب پرستوں کی ایک قسم وہ ہے جو برطانیہ فرانس جیسے ممالک سے پڑھ کر آتے ہیں، جہاں اُن کا تعلق مبشرین ومستشرقین اور مشنریوں سے مضبوط رہتا ہے، وہ اُن سے رابطے میں رہتے ہیں، پھر اپنے ملکوں میں آکر وہ ان کی طرف سے سفارت ونمائندگی کرتے ہیں، اور اپنے ممالک میں برطانیہ وفرانس کے اشارے پر انہیں اعلیٰ مناصب اور عہدوں پر فائز کیا جاتا ہے، جیسا کہ طٰہٰ حسین مصری جو وزیر تعلیم بنایا گیا، جو مغرب پرستوں کا ہیڈ اور سرمانا جاتا ہے۔ (موقع نبی الاسلام ﷺ)

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

تجدد پسندوں اورسیکولروں نے سیرت نگاری کیوں شروع کی؟

مرحلۂ اولیٰ: ۱۹۳۲ء میں امریکی یونیورسٹی کی طرف سے قاہرہ میں ایک بڑی عیسائی مشنری تحریک

مسلمان طلبہ کو نصرانی بنانے (تبدیل مذہب) کا کام کررہی تھی، یہ اُس وقت کی بات ہے جب اٹالین حکومت نے لوگوں کے اموالِ کثیرہ ضبط کر لیے تھے، تو ویٹی کن سیٹی نے ان اموال کے لوٹانے کا اعلان کیا، اس وقت یہ لہر زوروں پر تھی۔

مرحلۂ ثانیہ: جنگ عظیم ثانی نے لوگوں کے دلوں پر اثرات مرتب کیے، اور لوگوں کے ذہن رجعت پسندی یعنی دین سے برگشتگی کی طرف مائل کیے گئے، اور ان کے سامنے بمقابلہ اسلام اور سماوی مذاہب کے ایک جدید ماڈرن مذہب پیش کیا گیا، اس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے عوامل واسباب ہیں جن کی وجہ سے سیکولروں کو سیرت پر لکھنے کی سوجھی، مثلاً:

۱- لبرل پارٹی (حزب الاحرار) جس کے سایہ تلے مغربی دُعاۃ واساطین جمع تھے، جنھوں نے اپنی ایسی کتابیں اور تحریرات ومضامین شائع کیے، جو اسلام کے بنیادی افکار وتصورات کے منافی تھے، اور جن سے لوگوں کے جذبات مشتعل ہوتے اور بھڑکتے تھے، انہی تحریرات میں سے ایک تحریر طٰہٰ حسین کی ،جس کا نام "الشعر الجاهلی"، علی عبدالرزاق کی "الإسلام وأصول الحکم" ہے؛ ان کتابوں میں وہ افکار وخیالات بیان کیے گئے جو اسلام کے منافی تھے، اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایسی چیزیں لکھی، جن سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے۔

۲- دوسری جنگ عظیم کے موقع پر سرمایہ داروں اور بالشویکوں کے درمیان اتحاد ہوا، عرب ممالک میں کمیونزم کے پروپیگنڈہ نے زور پکڑا، اس دور میں مغرب کے سیکولر فکر کے حاملین کے درمیان اپنے پیشواؤں کی انفرادی برتری کو ثابت کرنے کا رجحان عام ہو چلا تھا، لہٰذا ان کے دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی اپنے پیشواؤں کی برتری کو مغربی انداز میں برتر ثابت کرنے کا رجحان مغرب زدہ افراد میں عام ہوا، ان سیکولروں کی طرف سے سیرت پر مختلف تحریریں مختلف اخبارات میں شائع ہوتی رہیں، انہیں میں سے چند کتابیں جو منظر عام پر آئیں یہ ہیں:

(۱) {حیاۃ محمد ﷺ} تالیف "امیل درمنجم" (Emile Dermanjem)، تلخیص وتعلیق ڈاکٹر محمد حسین ہیکل

1932))

(۲) {علی هامش السیرة "سوانح رسول ﷺ"} ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری((1933

(۳) {عبقریة محمد ﷺ} استاد عقاد((1942

یہ تینوں مصنفین ادبی مطالعہ اور سیاسی آزاد خیالی میں مشہور ومعروف ہیں، اور تجدد پسند وسیکولر ذہنیت کے حامل ہیں، جنہیں اسلامی مطالعہ سے بہت کم دلچسپی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ تجدد پسندوں نے جو سیرت پر قلم اٹھایا تو ان کی نیت اسلام کی خدمت نہیں تھی، بلکہ اہلِ مغرب کی سیاست میں تعاون تھا، اسی لیے تو اہلِ مغرب کے ہمنوا اخبارات ایسے لوگوں کی تحریروں کو پوری اہمیت کے ساتھ شائع کرتے تھے، خاص طور پر مصر سے صادر ہونے والا "جریدة السیاسة" اسلام کے خلاف محاذ آرائی میں پیش پیش تھا (اور محمد حسین ہیکل، طٰہٰ حسین مصری، علی عبد الرزاق، محمد بن عبد اللہ عنان کی تحریروں کو بڑھ چڑھ کر شائع کرتا تھا)، گویا اسلامی عقائد اور افکار کو زد پہنچانے کا ایک میدان انہوں نے سیرت کو بنایا، اس کا اندازہ ایک تجدد پسند مصنف محمود عقاد کی قلمی کاوشوں سے بھی ہوتا ہے کہ (جب صحیح الفکر مسلمانوں نے اپنے اسلاف کی کتابوں کو شائع کرنا شروع کیا)، تو اس نے جریدہ "روز الیوسف" میں شائع شدہ ایک مقالہ میں لکھا کہ یہ کتابیں "وطنیت" کے خلاف کھلا چیلنج ہیں، پھر طٰہٰ حسین نے بھی قلم اُٹھایا، جب علماء نے اس کی تحریروں پر سخت گرفت کرنی شروع کی، تو محمد حسین ہیکل اور علی عبد الرزاق طٰہٰ حسین کے دفاع کے لیے میدان میں کود پڑے۔

معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا مقصد اسلام کی خدمت نہیں بلکہ مسلمانوں کے جذبات کے ساتھ کھلواڑ کرنا تھا، اور ایسا ہوا بھی، کہ ان کے الفاظ اور عمدہ و پیچیدہ تعبیرات کے جال میں مسلمانوں کی بڑی تعداد پھنس گئی اور یہی ان کا مقصد بھی تھا، ان مغربی فکر سے متأثر افراد کو جو لوگ آلۂ کار اور مہرا بنا رہے تھے، ان کے پیشِ نظر دو اہم اہداف تھے:

۱- مسلمانوں میں اسلام اور ایمان کے تئیں جو بیداری پیدا ہو رہی تھی، اس کو پست کرنا، اور جو لوگ پورے زور وشور کے ساتھ اسلام کے ہر میدان میں برتری ثابت کرنے کی کوششیں کر رہے تھے ان کی حوصلہ شکنی کرنا، تاکہ ان کی سعیٔ پیہم سے سیکولرزم اور تجدد پسندوں کو جو زَد پہنچ رہی تھی اس کا سدّ باب ہو سکے،

اسی لیے انہوں نے بڑی مکاری کے ساتھ تجدد پسندوں کی تحریروں کو صحیح الفکر والعقائد قلمکاروں کے مقابلہ میں ''التقدیم البدیل'' یعنی ترقی کا متبادل طریقۂ کار کا نام دیا؛ بظاہر یہ اسلام کی خدمت معلوم ہورہی تھی، مگر درحقیقت وہ صحیح اسلام کے خلاف ایک محاذ تھا، ان کے اس مکر سازش کو نہ سمجھنے کی وجہ سے عام مسلمان ان تجدد پسندوں کی تحریروں میں دلچسپی لینے لگے جس کے بدترین اثرات آج ہمارے سامنے ہیں۔

۲- دوسرا ہدف سیرت اور تاریخ اسلام کو مغربی نقطۂ نظر اور انداز فکر میں مسلمانوں میں رواج دینا، اور مغربی نقطۂ نظر سیرت اور تاریخ اسلام کے بارے میں یہ ہے کہ بیہودہ اور دوراز کار تاویلات کے ذریعے وحی اور غیبیات ومعجزات سے گویا دبے انداز میں انکار۔

مگر الحمد للہ ان کی یہ سازش دیرپا ثابت نہ ہوسکی، بلکہ علماء اسلام کی ایک جماعت نے ان تجدد پسندوں کی تمام خامیوں کی علمی وعقلی انداز میں گرفت کی، اور ان کے ناپاک عزائم سے پردے کو چاک کردیا، اور یہ ثابت کردیا کہ طٰہٰ حسین مصری، محمود عقاد، محمد حسین ہیکل، علی عبدالرزاق، محمد بن عبد اللہ عنان اور برصغیر میں سرسید وغیرہ مغرب اور مستشرقین کے آلۂ کار ہیں، جن کی نیت محض اپنا مادی فائدہ تھا، ان کو اسلام کی صحیح ترجمانی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

اصول سیرت نگاری

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کے کچھ اصول ہیں، جس طرح اسلام کی دیگر موضوعات مثلاً تفسیر حدیث، فقہ، علم کلام، علم تاریخ وغیرہ کے لیے: اصول تفسیر، اصول حدیث، اصول فقہ، اصولِ علم کلام، اصول علم تاریخ ہیں، اسی طریقہ سے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی اصول ہیں؛ جن سے استفادہ کرتے ہوئے سیرت

النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھی جانی چاہیے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ اصولِ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مستقلاً نہیں لکھا گیا کہ مآخذ، مصادر متعین ہوتے اور فنی بنیادوں پر بہتری پیدا ہوتی، اور سیرت نگاری میں افراط وتفریط سے بچا جاسکتا، اس طرف بہت کم لوگوں نے توجہ فرمائی ہے، تاہم مستقل کتب اگرچہ نہیں لکھی گئی ہیں، لیکن ضمناً بعض کتبِ سیرت میں مجملاً یہ بحث موجود ہے۔

اصولِ سیرت کے اصول کچھ تو مصادرِ اصلیہ ہی سے ماخوذ ہیں، اور کچھ فرعیہ سے، سیرت کا بنیادی مصدر خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے وہی کچھ صادر ہوتا تھا، جو قرآن کریم کی تعلیم ہے، جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے: کہ نبی کے وہی اعمال واخلاق تھے، جن کی قرآن نے تعلیم دی ہے۔

لہٰذا اس اعتبار سے اصول سیرت کا پہلا مأخذ قرآن ہے، اور پہلا اصل بھی قرآن ہے۔

اصل اول: قرآن

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ کے لیے اس پر لکھنے یا اسے پڑھنے کے لیے سب سے پہلے قرآن کریم کو مرجع بنانا پڑے گا، کہ قرآن کریم آپ کی سیرت کو کس انداز میں بیان کرتا ہے: {فاقصص القصص لعلھم یتفکرون}

آیت کریمہ سے صاف واضح ہے کہ کلامِ پاک میں سیرتِ انبیاء مذکور ہے اور اسے بیان کرنے کا حکم بھی ہے۔

لہٰذا آپ کی سیرت جاننے کے لیے جب ہم کلام پاک اٹھاتے ہیں، تو ابتداء سے لے کر انتہا تک، یتیمی اور غربت سے لیکر جوانی اور مالی فراغت تک، تلاش حق سے لیکر بعثت ونزولِ وحی تک، دعوت وتبلیغ سے لیکر مخالفتِ کفار تک، ظلم وستم سے لیکر ظالموں کی سرکوبی تک، ہجرت سے لیکر فتحِ مکہ تک، کیا غزوات، کیا سرایا، کیا گھریلو زندگی، اور کیا بیرونی زندگی، کیا معاملات اور کیا معاشرت، کیا عبادات اور کیا اخلاقیات، غرض زندگی کے ہر پہلو کو کلام اللہ بیان کرتا ہے، اور بانگ دہل اعلان کرتا ہے: {لقد کان لکم في رسول اللہ اسوۃ حسنۃ} اس لیے قرآن کریم سیرت نگاری کا مآخذ اول ہے، کوئی قرآن کریم سے مستغنی ہوکر سیرتِ رسول پر روشنی نہیں ڈال سکتا، ہا

ں البتہ دوسرے مآخذ سے استفادہ کیے بغیر قرآن کریم ہی میں اچھی طرح کوئی غور خوض کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اورصرف قرآن شریف کوسامنے رکھکر سیرت پر قلم اٹھائے تو وہ سیرت کے ہر پہلو کو اجاگر کرسکتا ہے۔

ہاں بعضوں نے قرآن کریم کی بنیاد پر سیرت نگاری کی کوشش کی ہے، میں یہ تونہیں کہتا کہ مکمل سیرت کو بیان کر دیا، ہاں البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اس میں کمی ہماری ہے کہ ہمارے اندر اتنی طاقت اور لیاقت نہیں کہ کامل طریقہ پر کلام پاک میں غواصی کریں، اوراس کے تمام قیمتی جواہر پاروں کو اخذ کر کے آشکارا کردیں۔

بہرحال قابلِ ستائش ہیں، وہ سیرت نگار جنہوں نے قرآن کریم سے سیرت نگاری کی اپنی سی کوشش کی اور کافی کچھ بیان کیا ہے۔

آیت قرآنیہ اور سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم

خوف وخشیت الٰہی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم: {قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ}

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعاءِ خلیل اور نوید مسیح ہونا: { رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُزَکِّیْهِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔}

{وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ}

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں نام محمد واحمد: {مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ} (الفتح: ۲۹)

{وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ} (الصف: ۶)

کلام پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطابی وصفاتی نام: یٰسٓ۔ طٰہٰ۔ مزمل۔ مدثر وغیرہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات عالی یعنی عبدیت ورسالت: {اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا۔} (الکهف: ۱)

{قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا الَّذِیْ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ}

(الأعراف: ۱۵۸)

آپ کی مکی اور مدنی زندگی کی جھلکیاں، یتیمی، وغربت میں پرورش اور جوانی میں معاشی آسودگی۔

{اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی وَ وَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی}(الضحی)

اسی طریقے سے، بعثت سے پہلے کی پاکیزہ زندگی، حقیقت کی تلاش کے لیے مجاہدے، منصب نبوت سے سرفرازی، آغاز وحی، مکہ میں تبلیغ اسلام، قریش کی مخالفت اور ایذا رسانی، حضرت ابوبکرؓ کے ہمراہ ہجرت مدینہ، مدینہ میں مہاجرین، انصار، منافقین اور یہود کا اخلاق وکردار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا سلوک، آپ کے غزوات، فتح مکہ، حجۃ الوداع وغیرہ، سب کا تذکرہ قرآنی آیات میں بالتفصیل مذکور وموجود ہے۔ یہ آیات اور ان کے علاوہ دیگر ڈھیر ساری آیات، جو اختصار کے پیش نظر ذکر نہیں کی گئی، انہیں جمع کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری مرتب کی جاسکتی ہے۔

اس کے علاوہ ازدواجی زندگی، معاشرتی تعلقات، سیرت وکردار، اخلاق وعادات وغیرہ پر بھی بہت ساری آیات ہیں۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وآداب سے تو پورا کلام پاک بھرا ہوا ہے۔

آپ کو رحمۃ للعالمین قرار دیا گیا {وما أرسلنٰک إلا رحمۃ للعالمین}

قرآن کریم کی بیشتر آیت وسورت آپ کی واضح سیرت بیانی کرتی ہیں، اس لحاظ سے قرآن کریم کا متن سیرت نگاری کا پہلا اصل ومصدر ہے۔

دوسرا اصل: تفسیر قرآن

قرآنِ کریم کے بعد سیرت کا دوسرا مآخذ تفسیر ماثور ہے، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول تفسیری روایات، تفسیر مأثور اس تفسیر کو کہا جاتا ہے، جو قرآن کریم کے متن یا سنتِ صحیحہ یا صحابہ کرامؓ وتابعینؒ سے منقول ہو۔

''ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کیا، تاکہ آپ لوگوں کو اس کی تفسیر بیان کردیں'' آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ پہلے مفسر خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، چنانچہ جب قرآنی آیات کی تشریح وتوضیح کی جاتی ہے، تو سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے وہ مقامات زیادہ اہم ہوجاتے ہیں، جہاں اللہ تعالیٰ نے خود آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنایا ہے، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مختلف واقعات کی طرف اجمالی اشارہ کیے گئے ہیں، (ایسے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت ہی حقیقی تفسیر اور سیرت کی بنیاد ہوتی ہے) اسی طرح جب یہ معلوم کرنا ہو کہ آیات قرآنی کے اوقاتِ نزول، اسباب اور مقامات کون کون سے تھے؟ اور ان کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے کیا تعلق تھا؟ اس کی وضاحت فقط تفسیر سے ہوتی ہے، اس لیے کتب تفاسیر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اہم سرچشمہ قرار دی گئی ہیں۔

جن عظیم شخصیات نے سیرت ومغازی کو جمع کیا ہے، انہی سے تفسیر قرآن کا ذخیرہ بھی منقول ہے۔

تیسرا اصل: علم حدیث

سیرت نگاری کے اصولوں میں سے ایک اصل ومصدر ذخیرۂ حدیث ہے، بلکہ سیرت حدیث کا حصہ ہے۔ اور سیرت بغیر حدیث کے مکمل نہیں ہوسکتی ہے، خود سیرت کا بہت بڑا ذخیرہ کتب احادیث میں محفوظ ہے۔

ہاں البتہ حدیث کو سیرت پر فوقیت حاصل ہے، کیوں کہ اخذ حدیث کے لیے جو کڑی شرطیں ہیں، سیرت کے نقل کرنے میں انکا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

قرآن کریم سے حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ویسا ہی ہے، جیسا تعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ سے ہے، یعنی جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اللہ کے پیغامبر، ترجمان، اور اس کے احکام کو نافذ کرنے والی ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث قرآن کریم کی شارح، ترجمان اور تفسیر ہے۔

قرآن کریم کی تفہیم حدیث کی تعلیم پر موقوف ہے، قرآن کریم کے مجمل احکام کی تفصیل عموم کی تخصیص، اور مدلولات کی تعیین کا واحد اور مستند ذریعہ حدیث ہے، برایں بنا ارشاد ربانی ہے:

{ما اٰتکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا}

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تمہیں دیں وہ لے لو اور جن سے تمہیں روکیں اس سے رک جاؤ۔"

ان تمام چیزوں سے ثابت ہے کہ احادیثِ نبوی یہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل ماخذ ہے، لیکن اس بات کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ جن احادیث سے ہم سیرت بیان کریں، ان کی صحت وسقم کی تحقیق کریں، حضرت مو

لانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ذخیرۂ حدیث کی صحیح وضعیف کے لحاظ سے ۳؍قسمیں کی ہیں۔

''حدیث کی کتابیں تین قسم کی ہیں:

(۱) جس میں مصنف نے اس کا التزام کیا ہو کہ صحیح حدیث کے سوا اور کسی قسم کی حدیث نہیں لے گا، جیسے بخاری شریف اور صحیح مسلم وغیرہ، اس کی مثال نسخۂ طبیب کی طرح ہے کہ بیمار کے لیے مفید ہے۔

(۲) جس میں مصنف نے صحیح اور ضعیف ہر دو قسم کی حدیثوں کو جمع کر دیا ہو، لیکن صحیح کو جدا اور ضعیف کو جدا بیان کیا ہو، جیسے ترمذی شریف، اس کی مثال کتبِ طب میں ذکر کردہ ادویۂ مفردہ، مرکبہ، نافعہ وغیرہ جیسی ہے۔

(۳) جس میں مصنف نے موضوعات، احادیثِ ضعیفہ وغیرہ کو جمع کر دیا ہو اور غرض یہ ہو کہ دیندار اور سادہ لوح ان احادیث کو غیر معتبر سمجھ کر ان سے باز رہیں، اس کی مثال اس کتاب جیسی ہے، جس میں طبیب پرہیز کی چیزوں کی تفصیل لکھ کر حوالہ دے، تاکہ کل کے دن کوئی دھوکہ نہ کھاوے، جیسے (عمدۃ الاقاویل فی تحقیق الاباطیل) اسی قسم کی ہیں'' ان چیزوں کو سامنے رکھیں۔

قرآن مجید کے بعد سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا بڑا مآخذ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن کے راویوں کی تعداد ا؍لاکھ کے لگ بھگ ہے، اس ذخیرہ میں صحیح، قوی، ضعیف اور موضوع احادیث سب الگ الگ ہیں، محدثین نے بے حد تلاش، محنت، کاوش اور احتیاط کے بعد کتبِ احادیث مرتب کی ہیں، اور یوں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، ایسا بے مثال ریکارڈ محفوظ کیا، جس کی دنیائے تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

چوتھا اصل: شمائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تفسیر وحدیث کے ساتھ شمائل سے بھی گہرا تعلق ہے، شمائل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک، عادات وخصائل، معمولات زندگی، لباس، نشست و برخاست، قد، رنگ، بال جسم کے نشیب وفراز، خورنوش، مرغوبات ومکروہات، غرض بشری احوال کی تفصیلات جمع کی جاتی ہیں۔

سیرت کا شمائل سے تعلق:

سیرت نگاری میں جہاں اخلاق وعادات، افکاروخیالات وغیرہ کو پیش کرنا ہوتا ہے، وہیں شخصیت کے ذاتی خدوخال کو بھی پیش کرنا ہوتا ہے، تاکہ سامع وقاری اس شخصیت کو اپنے سامنے کھڑا ہوا محسوس کرے، اور یہ شمائل سے استفادہ کیے بغیر ممکن نہیں۔

پانچواں اصل: علم مغازی وسرایا

علم السیر ، حدیث، شمائل، اور مغازی ایک ہی تصور کے مختلف رخ ہیں، اس لیے کہ ان سب کا موضوع نبی کی ذات، تعلیمات اور آپ کا عمل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا ایک پہلو رحمۃ للعالمین ہونا ہے، تو اسی رحمت کا دوسرا تقاضہ قتال فی سبیل اللہ ہے، جس کے بابت قرآن گویا ہے: {محمد رسول اللّٰہ والذین معه أشداء علی الکفار رحماء بینهم} محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں کے مقابلہ میں سخت ہیں، اور آپس میں ایک دوسرے کے لیے رحم دل ہیں۔

مسلمان اپنے آغازِ عہد سے حالت جنگ میں رہے، اسلام کو مٹانے کے لیے خفیہ سازشوں کے ساتھ تیر وتلوار کا استعمال بھی کیا گیا اور اب بھی کیا جا رہا ہے، جن کا جواب دینا ہر مرد کامل اور باغیرت انسان کا حق ہے، اس جوابی کارروائی کا حصہ دفاعی کے ساتھ کبھی اقدامی بھی ہوتا ہے، مجموعی سرگزشت کو غزوہ، جہاد، قتال، کا نام دیا جاتا ہے، خلاصہ کلام یہ کہ کتب مغازی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزواتی پہلو (جنگی پہلو) کو بیان کیا جاتا ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی نہایت اہم کڑی ہے، اس لیے سیرت نگاری کے لیے کتب مغازی سے بحیثیت اصل استفادہ کرنا چاہیے۔

چھٹا اصل: معاہدات، مکاتیب، فتاویٰ وطب نبوی ﷺ

سیرت طیبہ ﷺ سے جدا کر کے کچھ پہلوؤں پر الگ حیثیت میں انہیں مدون کیا گیا ہے، ان میں سے ایک آپ ﷺ کے معاہدات ومکتوبات کا پہلو ہے، دوسرے آپ کے فیصلہ وفتاوی ہیں، تیسرے طب کے حوالہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدایات ہیں، یہ موضوعات درج ذیل اقسام پر مشتمل ہیں:

(۱)...... نئے معاہدے یا پرانے معاہدوں کی تجدید۔

(۲)...... تبلیغی نقطہ نظر سے لکھے ہوئے خطوط۔

(۳)...... سرکاری نمائندوں کو ارسال کیے گئے خطوط، احکامات وہدایات۔

(۴)...... اجراء دستاویزات، ملکیت اراضی واجناس وغیرہ۔

(۵)...... مخصوص افراد کے لیے ہدایات، جیسے خطبہ حجۃ الوداع۔

(۶)...... جوابی خطوط۔

(۷)......مسلمانوں یا غیر مسلموں کی جانب سے آپ کو حکم بنانا اور اس کی روشنی میں فیصلوں کا اجراء عمل میں آنا جسے فتاوی کا عنوان دیا گیا ہے۔

(۸)......یا مسلمانوں کا آپ سے کوئی مسئلہ دریافت کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب عنایت فرمانا

(۹)......آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیماری میں خود اپنا علاج کرنا۔ بیماری کے لیے دوا تجویز کرنا۔

سیرت کا معاہدات، مکاتیب، فتاویٰ وطب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق:

آپ ﷺ کی شخصیت نبی ہونے کے ساتھ سربراہ وقائد کی بھی تھی، اسی حیثیت میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کی طرف سے دیگر اقوام سے معاہدے کیے، ان سیاسی معاہدوں کا آغاز مدینہ سے شروع ہوتا ہے، گویا آپ ﷺ کی شخصیت کا یہ وہ پہلو ہے، جس سے اقوام وملل کے ساتھ معاملات کے اسلوب کی نشاندہی ہوتی ہے، اور کسی انسان کے اندر کی انسانیت کو اس کے معاملات ہی سے پرکھا جاتا ہے، اور کسی قائد کا خلوص وتعلق اپنے ماتحتوں سے انہی روابط سے واضح ہوتا ہے، کہ وہ اپنے ماتحتوں سے کتنا قریب ہے، ان کے اجتماعی وانفرادی مسائل حل کرنے میں کس حد تک متفکر رہتا ہے۔

لہٰذا سیرت نگار کے لیے ضروری ہے، کہ وہ اس اصل سے بھی واقفیت رکھتا ہو، اور طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسے آگاہی ہو، تاکہ آپ ﷺ کی شخصیت کے اس پہلو کو بہتر طور پر نکھار کر قاری وسامع کے سامنے پیش کرسکے۔

ساتواں اصل: علم دلائل النبوۃ والمعجزات

دلائل النبوۃ کا مطلب ہے، ایسے دلائل جو نبی کی نبوت کی صداقت واشاعت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیے جاتے ہیں، یہی مفہوم معجزہ کا ہے، یعنی ایسی دلیل جس کا جواب دینے سے مخالفین عاجز آجائیں۔ **سیرت کا دلائل ومعجزات سے تعلق:** سیرت کا دلائل سے بھی تعلق ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دلائل سیرت ہی کا حصہ ہے، اور آدم علیہ السلام سے ہمارے پیغمبر تک تمام انبیا کو نبوت کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر زمانہ کی مناسبت سے، اس زمانہ کے علم وفن کے مطابق معجزات عطا کیے جاتے رہے ہیں۔

اور قلم کاروں اور سیرت نگاروں نے اس موضوع پر بہت ساری کتابیں لکھ چھوڑی ہیں، جو اس موضوع پر پڑھنے والوں کی تشنگی دور کرنے کے لیے کافی وافی ہیں، ایسے تو اس موضوع پر ڈھیر ساری کتابیں ہیں، لیکن دلائل النبوۃ امام حافظ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ اس کی بات ہی کچھ اور ہے، جس کا تعلق پڑھنے سے ہی ہے۔

الغرض! آپ ﷺ دلائل النبوۃ والمعجزات کو ذکر کیے بغیر سیرت کامل نہیں ہوسکتی، جس کے لیے اس موضوع کی معتبر کتابوں سے استفادہ ضروری ہے۔

آٹھواں اصل: علم قصص الانبیاء والمرسلین

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں: قرآن مجید نے انسانی دل و دماغ میں توحید و رسالت کے مضامین کو اتارنے کے لیے، جو وسائل و ذرائع اختیار کیے ہیں، ان میں قصص و حکایات کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔

قرآن کریم نے قصہ کو بہت اہمیت دی ہے۔ آپ دیکھیں کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے تذکرے واقعات اور قصے کتنے مقامات پر قرآن کریم نے ذکر کیے ہیں، ایک پوری سورۃ حضرت یوسف علیہ السلام سے متعلق ہے، یہ پوری سورۃ ان کے قصہ پر مبنی ہے، اور اعلیٰ درجہ کی دانشمندانہ باتوں اور مواعظ پر مشتمل ہے، ایسے واقعات پر مبنی ہے کہ ان کے بغیر بہت سے حقائق سمجھ میں نہیں آسکتے، خود قرآن کریم کہتا ہے: {لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب ما کان حدیثا یفتری ولکن تصدیق الذی بین یدیہ} "ان قصوں میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں، یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں، بلکہ پچھلے واقعات کی تصدیق ہیں۔"

سیرت کا قصص الانبیاء سے تعلق

قرآن کی واضح تعلیم ہے کہ انبیاء وامم سابقین سے استفادہ کرو، عبرت و نصیحت کے نقطہ نظر سے ہمارے پیغمبر پر جو حالات گزرے، وہ پچھلوں پر بھی گزرے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر کئی عمل میں اپنے کو پچھلے انبیا کا مشابہ قرار دیا ہے، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو سمجھنے کے لیے، ہمیں ان قصص سے استفادہ کرنا چاہیے۔ قصص کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱)......قصص القرآن (۲)......قصص الحدیث

قرآن کریم نے جن قصوں کو بیان کیا ہے، وہ بھی سیرت نگاری کی اصل ہیں اور حدیث میں، جن قصوں کو بیان کیا گیا ہے، وہ بھی سیرت نگاری کی اصل و مآخذ ہیں۔ لہٰذا ہر دو سے استفادہ ضروری ہے۔

نواں اصل: علم آثار صحابہؓ وصحابیاتؓ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول عمل کو آثار نبوی کہا جاتا ہے، اسی طرح جب یہ لفظ مطلقاً استعمال ہوتو بھی یہی مطلب ہوتا ہے، لیکن جو عمل صحابہؓ یا صحابیاتؓ سے منقول ہوا سے آثار صحابہ کہتے ہیں۔

سیرت کا آثار صحابہ سے تعلق:

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کریم کے احکام پر اسی وقت صحیح طور سے عمل کیا جا سکتا ہے، جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو نمونہ بنا کر ان طریقوں کو اپنایا جائے، اور ویسا ہی عمل کیا جائے جیسا آپ نے کر کے دکھایا، یہی سیرت ہے اور یہ عمل ہم تک صحابہ کے توسط سے پہنچا ہے، گویا دوسرا نمونہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل ہے، جسے تعاملِ اہل مدینہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

صحابہ کرامؓ نے آپ کی صحبت میں رہ کر آپ کے جلوت وخلوت کے احوال کو جانا اور نہ صرف جانا بلکہ اسے مانا اور اپنی زندگی اور اپنا ہر عمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق کرنے کا ٹھانا، اور رہتی دنیا تک کے لیے، محبت، جاں نثاری، تابعداری کی اعلیٰ مثال پیش کی، جسے قرآن نے صراط مستقیم سے تعبیر کیا، اور امت کو حکم دیا کہ ہر رکعت میں اس کی دعا کرو "**اھدنا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیھم**" اور کہیں فرمایا "**رضی اللہ عنھم ورضوعنه**"۔

الغرض! سیرت کو سمجھنے کے لیے اقوال صحابہ، آثار صحابہ وصحابیاتؓ بہت اہم ہیں، صحابہ مشاہد ہیں، نزول آیات وواقعات کے، پس منظر کے، لہٰذا صحابہ کے دلائل ومعجزات سے استفادہ کیے بغیر تاریخ میں کمال پیدا نہیں ہوسکتا۔

دسواں اصل: علم رجال حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم:

علم رجال حدیث اس علم کے ذریعہ جو معیار قائم کیا گیا ہے، وہ نہایت ہی مستحکم ومضبوط ہے، جس میں غلط بیانی کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے، اس کے قیودات میں سے پہلا قید ہی یہ ہے کہ سیرت بیانی کرنے والا شخص ثقہ ہو، اس طور پر کہ وہ مشاہدِ واقعہ ہو، یا مشاہد واقعہ تک تمام راویوں کو بالترتیب جانتا ہو، اور ساتھ ساتھ ان تمام راویوں کے حالات کا بھی علم ہو کہ یہ کون تھے، ان کے مشاغل، اخلاق، حافظہ، فہم، ثقافت وغیرہ کس درجہ کے تھے، تاکہ ہر اعتبار سے اعتماد ہوجائے، کہ یہ بات جو بیان کی جارہی ہے، مطابق واقعہ ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی خلط نہیں۔

سیرت کا علم رجال سے تعلق:

صحابہ کرام کے حالات جن کتابوں میں جمع کیے گئے ہیں، انہیں کتب ''اسماء الرجال'' کہا جاتا ہے، یہ کتابیں اس لحاظ سے بڑی مفید ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے حالات وکوائف کو ضبط کرتے وقت ضمناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات بھی ان میں محفوظ ہو گئے ہیں، کیونکہ صحابہؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا، سیکھا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو بھی واقعہ ان کی نظر سے گزرا، وہ سب کچھ صحابہ نے اپنے راویوں کے سامنے بیان کیا، یوں صحابہ کرامؓ کے حالات سے بالواسطہ ہمیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات زندگی بھی معلوم ہو گئے۔

گیارہواں اصل: علم تاریخ

سیرت بھی ایک حیثیت سے تاریخ ہے، اس لیے کہ تاریخ کے دائرہ میں سوانح بھی داخل ہے، جو کتابیں تاریخ اسلام والمسلمین کے حوالہ سے مرتب کی گئی ہیں، ان میں سے اکثر کا ابتدائی حصہ یا درمیانی حصہ سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصولِ سیرت میں سے ایک اصول تاریخ کو قرار دیا گیا ہے۔

(۱)......مثلاً طبقات ابن سعد کی ابتدائی ۲ جلدیں سیرت پر ہیں۔

(۲)......المعارف لابن قتیبہ میں دیگر انبیاء کے ساتھ ہمارے نبی کا نسب نامہ وکوائف ہیں۔

(۳)......المحبر بن حبیب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، اولاد، ازواج، غزوات وخلفا کا ذکر ہے۔

(۴)......تاریخ طبری میں سیرت کا مواد موجود ہے۔

(۵)......تاریخ مدینہ، دمشق لابن عساکر کی پہلی جلد سیرت پر ہے۔

(۶)......المنتظم فی تاریخ الملوک والامم۔

(۷)......المختصر فی اخبار البشر خلاصہ الکامل لابن الاثیر۔

(۸)...... البدایہ والنہایہ لابن کثیر۔

(۹)......تاریخ الاسلام محمد حسین ذہبی جلد اول، یہ کتابیں اور ان کے علاوہ دیگر بہت ساری کتابیں سیرت پر مشتمل ہیں، سیرت نگار تاریخ کی مدد سے سیرتِ طیبہ کی کڑیاں باہم مربوط کرسکتا ہے، اور سیرت کو زیادہ نکھار کر پیش کرسکتا ہے۔ مثلاً ہجرت پر لکھنے والا اسی وقت حق ادا کرے گا، جب وہ حبشہ کے حکمرانوں، حبشہ کی تا

ریخ، اہل حبشہ کے مذاہب وغیرہ سے استفادہ کر کے لکھے گا اور یہ مواد سیرت سے نہیں بلکہ تاریخ سے ملے گا۔

بارہواں اصل: علم تاریخ حرمین

اسلام میں تین مقامات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، مکۃ المکرمہ، مدینۃ المنورہ اور بیت المقدس۔ بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ دوم رہا ہے اور معراج وسیادۃ الانبیاء کا ذریعہ تھا، اس حوالہ سے سیرت سے بھی اس کا تعلق ہے۔

مکہ ومدینہ کو حرمین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مکہ کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے، جتنی خود انسان کی، یہ خصوصیت کسی اور خطہ کو حاصل نہیں، اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے: {ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا و ھدی للعالمین} ''یعنی سب سے پہلا گھر مکہ کی سرزمین پر کعبہ ہے، جسے لوگوں کی ہدایت اور برکت کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے مستقل سیرت کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی تاریخ کے ساتھ بیت المقدس کی تاریخ، مقامات مقدسہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آثار قدیمہ، اور قدیم تہذیب کا ذکر ملتا ہے۔

سیرت کا تعلق تاریخ حرمین سے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی محترم مکہ ومدینہ وحرمین میں گزری ہے، اس کے مقابلہ میں بیت المقدس سے تعلق مختصر عرصہ کے لیے رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ تینوں مقامات کے حوالہ سے جو بھی کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ اس وقت تک نامکمل رہتی ہیں، جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہ آئے کعبۃ اللہ اور بیت المقدس کی تاریخ قدیم ترین ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے جب بھی سیرت نگاری کی جائے گی کعبہ کا ذکر ضرور آئیگا، اور سیرت نگار جب تک اس موضوع پر لکھی گئی کتب سے استفادہ نہیں کرے گا، نہ وہ کعبہ کی تعمیر بیان کر سکتا ہے، نہ اس کا ارتقاء، نہ عبادت کے اسلوب، نہ زائرین کی روایات، نہ زمزم کا ذکر، نہ حجر اسود کی آمد، نہ سالانہ میلے اور نہ قدیم تہذیبی روایات۔

ان مخصوص کتب میں مقدس مقامات کے حوالہ سے کچھ تذکرے ملتے ہیں، مثلاً تاریخ بنو ہاشم، بت پرستی کا آغاز، کعبہ کی تعمیر، بیت المقدس کی تعمیر، حضرت سلیمان و دیگر انبیاء کا تعلق، بیت المقدس کی یہود پھر نصاری کے ہاتھوں پامالی، مدینہ کے منافقین، قبیلہ اوس وخزرج کی تاریخ، یہود کی مدینہ میں آمد واخراج، قصہ فیل وغیرہ، ان مقامات مقدسہ پر لکھی ہوئی کتب میں، جن جزئیات کا احاطہ کیا گیا ہے، وہ عام تاریخی کتب میں دستیاب نہیں ہیں،

سیرت نگار بیت المقدس کا ذکر کرتے ہیں، لیکن اسے سالم، شالم یروشلم کیوں کہا جاتا ہے؟ اسی طرح اس کا نام یبوس وایلیاء کیوں ہے؟!!

اس کی تاریخ خاص بیت المقدس پر لکھی گئی کتب سے ہی ممکن ہے۔ لہٰذا سیرت نگار کے لیے ضروری ہے، کہ وہ تینوں مقامات مقدسہ پر لکھتے ہوئے ان کتب سے استفادہ کرے۔

تیرہواں اصل: علم جغرافیہ

تاریخ کی دو اصناف سے ہم بحث کر چکے ہیں۔ تاریخ ہی کی تیسری صنف کتب جغرافیہ اور اقالیم ہیں، جن میں مختلف ممالک اور علاقوں کی تقسیم ان کے نام، بحری بری راستوں کی رہنمائی ملتی ہے، اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ کون سا خطہ کب کس ملک کے زیر نگیں رہا؟ ان کتب سے ہمیں جزیرۃ العرب کی اسلام سے پہلے کی حالت اور عہد نبوی کے مد و جزر، پھر فتوحات و بغاوتوں کے سلسلوں کو سمجھنے میں سہولت اور مدد حاصل ہوتی ہے۔ علم جغرافیہ میں جدید اٹلس بھی شامل ہے، اس کے بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے لیے منتخب شدہ راستہ کو سمجھنا یا غزوہ خندق کے موقع پر خندق کھود کر مکہ کا دفاع کرنا یا غزوہ بدر الکبریٰ کے موقع پر مسلمانوں کا دشمن کو گھیرنا اور اس کا راستہ بدل کر بچ نکلنا، یہ وہ مباحث ہیں، جنہیں سیرت نگار انہی کتب کے ذریعہ سمجھ کر دوسروں کو سمجھا سکتا ہے۔ سیرت کے حوالہ سے بالعموم عرب کی سرزمین و جغرافیہ زیر بحث آتا ہے۔

سیرت کا جغرافیہ سے تعلق:

جغرافیہ بھی تاریخ کی ایک قسم ہے، جس طرح کتبِ تواریخ میں سیرت طیبہ کا تذکرہ ہے، اسی طرح کتب جغرافیہ میں بھی ہے، جیسے بلاذری نے اپنی علم جغرافیہ کی معروف کتاب فتوح البلدان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء کا تذکرہ کیا ہے۔

سیرت کا علم جغرافیہ سے بہت گہرا تعلق ہے، اگر کعبہ کا جغرافیہ بیان نہ کیا جائے؛ تو کعبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد، حجر اسود کی تنصیب کا واقعہ سمجھ میں نہیں آتا۔ جغرافیہ کے بغیر یہ سمجھنا اور سمجھانا مشکل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکان ابوجہل کے مکان سے کس سمت میں تھا کہ آپ کے گھر سے نکلنے پر وہ ایذاء رسانی کے درپہ ہوتا تھا۔ ہجرت کے وقت آپ کے مکان کا گھیراؤ کس طرح کیا گیا تھا؟ ہجرت کے وقت آپ نے کون سا راستہ اختیار کیا؟

مسجد نبوی کے اردگرد ازواج مطہرات کے مکانات کس ترتیب سے تھے؟ کن صحابہؓ کے مکانات اردگرد تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے اردگرد تمام مکانات کی کھڑکیاں بند کرنے کا حکم دیا تھا۔ سوائے ایک کھڑکی کے آخر کیوں؟ مسجد نبوی اور مسجد حرام کی توسیع کب کس نے کی؟ کس سمت میں ہوئی، کتنی وسعت اختیار کی، کس کس کے مکانات اس میں شامل ہوئے؟ قدیم حرم، مدینہ ومکہ کی حدود کیا تھیں؟ حبشہ کی سرزمین کہاں اور کتنے فاصلہ پر تھی۔

یہ تمام گتھیاں صرف اور صرف علم جغرافیہ کے ایک نقشہ، ایک چارٹ ایک اطلس ہی سے واضح ہو سکتی ہے۔

سیرت کے ان مذکورہ بالا پہلوؤں پر بے شمار محققین نے لکھا ہے، لیکن محمد الیاس غنی کی ایک مختصر کتاب بیوت الصحابہ، پورے ذخیرہ سیرت پر بھاری ہے، اس لیے اس میں اس علم کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔

سیرت نگاری کے اصولوں میں سے ایک اصل علم جغرافیہ بھی ہے، جس پر محقق سیرت نگار حضرات کے توجہ کی ضرورت ہے۔

چودھواں اصل: علم الانساب

یعنی ایسی کتابیں جس میں کسی شخص، خاندان، قبیلہ، قوم یا نسل کے نسب، رشتہ، خون، کے تعلق سے بحث کی جائے، عربوں کے ہاں نسب بہت اہمیت رکھتا تھا، انسان تو انسان عرب اونٹ گھوڑوں اور دیگر حیوانات تک میں حسب ونسب کا خیال رکھتے تھے، اسی بنیاد پر انسانوں، قوموں، قبیلوں سے سلوک ومعاملات کرتے تھے، تاریخ کی اس نوع کو سمجھے بغیر اس معاشرہ کو، جس میں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، سمجھنا ممکن ہی نہیں اور معاشرہ وتہذیب اور رواجات حسب ونسب کی اہمیت کو سمجھے بغیر، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی مشکلات کو سمجھنا اور آپ کس طرح ان مشکلات سے نبرد آزما ہوئے، ان کا سمجھنا ممکن ہی نہیں، گویا علم الانساب کے بغیر سیرت کو نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جو یہ نہیں جانتا لے پالک بیٹے کی اس معاشرہ میں کیا حیثیت تھی، وہ کیسے سمجھ سکتا ہے کہ آپ نے لے پالک بیٹے کی بیوی سے شادی کر کے کتنا اہم کام کتنی ہمت کے ساتھ انجام دیا، جو اس زمانہ کی قبائلی عصبیتوں کو نہیں جانتا، وہ سیرت کے اس پہلو کو قطعاً نہیں سمجھ سکتا کہ آپ مکہ سے طائف کیوں گئے تھے؟ اور دوبارہ مکہ میں کس بنیاد پر آئے تھے؟ شاہ حبشہ نے جعفر طیارؓ سے نبی کی تعلیمات سننے کے باوجود، کیوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب ونسب کی بابت سوال کیے تھے؟ اور جب ابوسفیان نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب نسب کی تصدیق کی، تو شاہ حبشہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی نہ صرف تصدیق کی، بلکہ مہاجرین کو

واپس کرنے سے انکار کردیا۔اس زمانہ کا انسانی اسٹیٹس اسی علم الانساب کی بنیاد پر طے ہوتا تھا،ابوسفیان کے بیان کے بعد شاہ حبشہ نے کہا: وكذالك الرسل تبعث في احساب قومها ، اسی بہتر نسب کے ساتھ انبیاء اپنی قوم میں مبعوث کیے جاتے ہیں۔

سیرت کا علم الانساب سے تعلق:

آپ نے اوپر ملاحظہ کیا کہ عرب معاشرہ میں صاحب نسب ہونا انتہائی اہمیت کا حامل تھا،ابوجہل و دیگر دشمنان نے آپ کی نبوت کا انکار کیا،آپ کے حسب و نسب کا نہیں اور یہی وہ اسٹیٹس ہے،جس کی وجہ سے آپ نے مختلف مواقع پر اس کا فائدہ حاصل کیا،سیرت طیبہ کو اس علم کی اہمیت واثر اندازی کا اندازہ لگائے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔

انسان کا سیرت طیبہ سے گہرا تعلق ہے۔یہی وجہ ہے کہ ابتدائی عہد کی کتب انساب میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا تذکرہ ہے،جیسے مسعودی کی التنبیہ والاشراف میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے ۔اور ابن قتیبہ نے اپنی کتاب المعارف کے دوسرے باب میں عربوں کے انساب کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و نسب کو بیان کیا ہے۔

پندرہواں اصل: علم اصول حدیث

سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حدیث نبوی کی طرح ہے، دونوں کا مصدر ایک ہی ذات ہے،لہٰذا دونوں کے اصناف کو پرکھنے کے اصول بھی ایک ہی ہونے چاہئیں ،دونوں قسم کی روایات کو پرکھنے کے لیے دو پیمانے مقرر نہیں کیے جاسکتے ؛اس لیے کہ حکم: "من كذب علی متعمدا فليتبوأ مقعده من النار۔"جس نے بالقصد میری طرف کسی ایسی بات کو منسوب کیا جو میں نے نہیں کہی،تو ایسے شخص کو چاہیے کہ اپنے لیے جہنم کو ٹھکانہ بنا لے۔

سیرت کا اصول حدیث سے تعلق:

سیرت اور حدیث دونوں کا مصدر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، دونوں اصناف کا مقصد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو صحیح حالت میں امت تک پہنچانا ہے،حدیث کے لیے جو اصول ہیں، وہی سیرت کے لیے ہونے چاہیے،لیکن عجیب بات ہے کہ حدیث کے حوالہ سے تو بہت کام ہوا،لیکن اصول سیرت پر توجہ نہیں دی گئی،

ممکن ہے اصول حدیث ہی کو اصول سیرت تسلیم کیا جاتا ہو، اس لیے جدا حیثیت میں ضوابط سیرت الگ لکھنے کا خیال کسی کو نہ آیا ہو۔

حدیث کا اصول حدیث سے جتنا قریبی و گہرا تعلق ہے، اتنا ہی سیرت کا اصول حدیث سے تعلق ہے۔ اس لیے میں نے (مصنف کتاب) سیرت نگاری کے اصولوں میں سے ایک اصول، اصول حدیث کو قرار دیا ہے، تاکہ سیرت نگاری اصول حدیث کی روشنی میں کی جائے اور زیادہ سے زیادہ مستند روایات سے سیرت نکھر کر لوگوں کے سامنے آئے۔

روایات سیرت کو قبول کرنے کے اصول:

روایات سیرت کو پرکھنے اور قبول کرنے کے وہی اصول ہیں، جو حدیث کے لیے مرتب کیے گئے ہیں، مولانا ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

محدثین نے جرح وتعدیل کے جو قواعد مقرر کیے اور صحیح وسقیم کے پہنچاننے کا جو معیار قائم کیا، وہ بلا کسی تفریق اور تخصیص کے سب جگہ ملحوظ رکھا گیا اور تمام حدیثیں خواہ احکام سے متعلق ہوں، یا مغازی اور مناقب سے سب اسی معیار سے جانچی گئیں، البتہ جن حدیثوں پر دین کا دارومدار تھا، جیسے عقائد اور حلال وحرام، محدثین نے ان کے قبول کرنے میں زیادہ تشدد سے کام لیا اور جن حدیثوں پر دین کا دارومدار نہ تھا، جیسے فضائل اور مناقب وہاں کسی قدر وسعت اور سہولت سے کام لیا گیا، اس لیے کہ وہاں کوئی عمل مقصود نہیں محض علم مقصود ہے، اس لیے ایسے مقام پر توسیع ہی مناسب ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ سے مروی ہے:

"اذا روینا فی الحلال والحرام تشددنا واذا روینا فی الفضائل تساھلنا"

جب ہم حلال ورحرام کے بارے میں روایت کرتے ہیں، تو تشدد کرتے ہیں اور جب فضائل ومناقب کے بارے میں روایت کرتے ہیں تو نرمی کرتے ہیں۔

۱۔ الحاصل صحت اور ضعف کا جو معیار اور جو ضابطہ احادیث احکام میں ہے وہی مغازی اور سیر میں ہے۔ اسی ضابطہ سے سب احادیث کو جانچا جاتا ہے، اور اسی کے مطابق بلا تفریق صحیح اور ضعیف کا حکم لگایا جاتا ہے۔

۲۔ جن محدثین نے اپنی کتاب میں صحت کا التزام نہیں کیا، ان کا مقصد یہ تھا کہ حدیث کا ذخیرہ

جمع ہو جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی منقول ہوا ہے، وہ سب ایک بار محفوظ ہو جائے، بعد میں اس کی تنقیح کر لی جائے گی، اس لیے کہ جب سند موجود ہے، تو پھر اس کو جرح و تعدیل کی کسوٹی پر، پرکھنا کیا مشکل ہے ۔

الغرض ان حضرات نے حدیث کے جمع کرنے کا پورا اہتمام کیا اور اس کی کوشش کی کہ کوئی حدیث جمع ہونے سے نہ رہ جائے۔ لہٰذا سیرت کی نکھار کے لیے اصول حدیث کی روشنی اور مستند روایات سے استفادہ نہایت اہم اور ضروری ہے۔

سولہواں اصل: علم الناسخ والمنسوخ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک حیات تھے، اسلامی احکامات کے نزول کا سلسلہ جاری تھا اور آخری لمحات تک یہ امکان موجود تھا کہ کسی بھی سابقہ حکم کو بلکلیہ ختم کر دیا جائے، یا اس کے مطلق حکم کو مشروط کر دیا جائے۔ یہ امکان، وحی جلی یعنی قرآن اور وحی خفی یعنی حدیث وسیرت دونوں جگہ یکساں تھا؛ لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہو گئے، تو یہ امکان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ ابتدائی عہد میں ناسخ ومنسوخ کا علم خواہ قرآن کریم سے متعلق ہو یا حدیث وسیرت سے۔ بہت اہمیت کا حامل تھا۔

سیرت کا ناسخ ومنسوخ سے تعلق:

ناسخ ومنسوخ کا قرآن، حدیث وسیرت سے یکساں تعلق ہے، حدیث کی طرح سیرت کا مصدر بھی نبی کی ذات ہے۔ حدیث کے حوالہ سے اس موضوع پر جو کتب لکھی گئی ہیں، اس میں بہت سے پہلوؤں کا تعلق سیرت طیبہ سے ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے اصولِ سیرت میں سے علم الناسخ والمنسوخ کو بھی شمار کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس حوالہ سے سیرت طیبہ کا کام کیا جائے، میرے علم کے مطابق اس پہلو پر اب تک کسی نے سیرت کے حوالہ سے نہیں لکھا ہے۔

سترہواں اصل: حکمت وعلم نفسیات

سیرت نگاری سے مقصود (محض) سیرت کی روایات وواقعات کو جمع کرنا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ سیرت نگاری کا مقصد حصول ثواب وبرکت کے ساتھ تبلیغ واصلاح ہونا چاہیے، اور سیرت نگاری قرآن کریم کے حکم کے مطابق حکمت اور انسانی نفسیات کا لحاظ کر کے کی جائے، تو بہتر اہداف حاصل ہو سکتے ہیں۔

سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکمت ونفسیات سے تعلق

حکمت کیا ہے اس پر مفسرین ومحدثین نے بحث کی ہے (اور متعدد معانی بتائے ہیں) اسی میں سے ایک معنی ہے: ہر وقت حالات ومخاطب کا لحاظ رکھتے ہوئے کوئی بات کہنا، مقاصدِ بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک مقصد قرآن کے مطابق حکمت کی تعلیم دینا تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ کے بعد جن صفات کے حامل نبی کا مطالبہ کیا تھا، اس میں تیسری صفت حکمت تھی۔ اور یہ حکمت ایسی صفت ہے، جو دیگر انبیا کے مقاصد بعثت میں بھی شامل تھی۔ ان پر ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمان ربانی ہے: {أتینا ال ابر اھیم الکتاب و الحکمة} حضرت لقمان علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام کو بھی حکمت عطا کی گئی: {و لقد أتینا لقمان الحکمة} اور عطاءِ حکمت کو خیر کثیر قرار دیا گیا: {و من یو ت الحکمة فقد اوتی خیر ا کثیر ا} حکمت انبیا کے علاوہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے، جسے چاہتے ہیں اسے بھی عطا کرتے ہیں ۔

مسلمانوں کو خصوصی طور سے تبلیغ ودعوت کے موقع پر اختیارِ حکمت کا حکم دیا گیا ہے: {ادع الی سبیل ربک بالحکمة و الموعظة الحسنة و جادلھم بالتی ھی احسن}

قرآن کریم نے جسے حکمت کہا ہے بعض محدثین نے اس سے حدیث مراد لیا ہے، اگر حدیث مراد لیا جائے تو بھی مدعیٰ ثابت ہے، یعنی سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دعوت دینا اسلوبِ نبویہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ، اگر اس سے علم نفسیات مراد لیا جائے، تو بھی سیرت نگاری کے لیے علمِ نفسیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

لہٰذا سیرت نگاری کے لیے ضروری ہے کہ سیرت نگار سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم نفسیات کی روشنی میں جائزہ لے۔ دوست، دشمن نے کس پیرایہ پر کیا بات کہی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس بات کا حکم دیا، یا کوئی کام کیا، تو اس کی نفسیاتی وجوہات کیا تھیں، اس میں کیا حکمت تھی، اس عقل ونقل کے امتزاج سے سیرت کے پیغام کو سیرت نگار موٴثر، جاذب النظر اور عہد حاضر کے مناسبت سے ڈھال کر دوہرے اجر کا مستحق ہوسکتا ہے۔

اٹھارہواں اصل: کتب مذاہب مقدسہ

بلند ایسے نہ رتبے کسی نبی کے ہوئے ‏ ‏ ‏ زہے نصیب کہ ہم امتی اسی کے ہوئے

اسلام دنیا کا آخری مذہب ہے،لیکن اس مذہب اور مذہبی پیغمبر کا تذکرہ پچھلے تمام انبیاء نے کیا،ان پر نازل ہونے والی کتب وصُحُف میں بھی ذکر کیا گیا اور آغازِ اسلام میں دیگر مذاہب کے بعض علماء اپنی کتب میں ہمارے پیغمبر اسلام اور پیغمبر اسلام کی سچائی کی نشانیاں اور آپ کی صداقت ونبوت، افضلیت وخاتمیت ،صرف کتب سماویہ ہی میں نہیں ،بل کہ بعض مذاہب کی کتب (بزعمہ) مقدسہ مثلاً گروگرنتھ وغیرہ میں بھی موجود ہیں۔

سیرت نگار مستشرقین ومخالفین کے خلاف بطور الزام یا بطور تائید اسلام ،ان کتب سے استفادہ کرکے اسلام اور سیرت کو بہتر و مدلل انداز میں پیش کرسکتا ہے۔

سیرت طیبہ در کتب مذاہبِ مقدسہ:

قرآن کریم نے دیگر انبیاء اور ان کی کتب سے استفادہ کی ترغیب دی ہے،ممانعت نہیں کی (جس کی تفصیل کتاب اصول سیرت نگاری جس سے یہ اصول اخذ کئے جا رہے ہیں کہ آٹھویں اصل میں قصص الانبیاء کے ذیل میں لکھا ہے) یہی وجہ ہے،بعض افراد کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے،کہ وہ اسلام قبول کرنے کے بعد میں ان کتب سے استفادہ کرتے تھے۔مثلاً عبداللہ بن سلام جو یہودی عالم تھے،اپنی کتاب میں موجود ہمارے پیغمبر کی علاماتِ نبوت کا مطالعہ کرکے مسلمان ہوئے تھے،ان سے انبیاء سابقین کی روایات کتب سیر ومغازی میں موجود ہیں۔

اسی طرح کعب بن احبار یہودی عالم تھے،آپ سے آدم وحواء کے حوالہ سے قدیم روایات منقول ہیں، حدیث ذی الکفل منقول ہے، وہب بن منبہ تابعی ہیں قصص عالم وانبیاء کے ماہر سمجھے جاتے تھے، بنی اسرائیل کی تاریخ کے عالم تھے،کتاب الملوک اور قصص انبیاء آپ کی یادگاریں ہیں،اسی طرح کتاب زبور داوٗد (**المعروف کتاب المزامیر**) کا آپ نے ترجمہ کیا تھا۔خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ،توریت کی عبادت پیش کرکے یہودیوں کو قائل کرنے کی کوشش کی اور عبداللہ بن سلامؓ نے اس کی تائید کی،ہمیں اپنے اس موقف پر قرآن کریم سے بھی تائید ملتی ہے۔

قرآن کریم نے اہلِ کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ، یہ لوگ اپنی کتب میں موجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات کا مطالعہ کرکے اور آپ کی سیرت کو دیکھ کر اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ آپ سچے نبی ہیں،

جسے قرآن کریم بایں الفاظ بیان کرتا ہے "یعرفونہ کما یعرفون ابنائہم" آپ کے سچے نبی ہونے کو ایسے ہی جانتے ہیں جیسے اپنے بچوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔

الغرض کتبِ سابقہ سماویہ اور دیگر مذاہب کی کتابوں میں بھی، آپ کے اوصاف واخلاق آپ کی علامات نبوت کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے، لہٰذا سیرت نگار کو ان کتب میں مذکور آپ کے اوصاف کو بیان کرنا از حد ضروری ہے، کتب سابقہ میں آپ کی آمد کی آسمانی بشارتیں موجود ہیں، مکہ معظّمہ کی نشاندہی کی گئی ہے، آپ کی جائے ولادت کی تعیین ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادات کا اعتراف ہے، ہجرت کا ذکر ہے کلام اللہ کا ذکر ہے اور خود ان مذاہب کا تہذیب اسلام کی آمد سے منسوخ ہونے کا ذکر ہے۔

الغرض یہ تمام چیزیں کتب سابقہ میں موجود ہیں، لہٰذا جب آپ کی سیرت کو ان کتابوں کے حوالہ سے بھی بیان کیا جائے گا، تو اغیار میں سے، وہ جن کے قلوب نرم ہوں گے اور حق کے متلاشی ہوں گے، وہ راہ یاب ہو جائیں گے اور جو ہٹ دھرم اور کج رو ہوں گے، ان کے دہن کو مہر سکوت لگ جائے گا۔

انیسواں اصل: علم ادب جاہلیہ

ابوالبرکات لکھتے ہیں: قدیم عرب کے تاریخی معلومات کے ذرائع باقی نہ رہے، صرف دو ذریعہ ہے کہ اس سے جو کچھ معلوم ہوا وہ تو بلاشبہ صحیح ہے، لیکن اس کے سوا اور جتنے ذرائع ہیں سب مشتبہ ہیں، ایک قرآن کریم ہے اس سے بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں، دویم خود جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیانات ہیں، ان دو کے سوا عرب جاہلیت کے اشعار اور زبانی روایتوں کا درجہ ہے؛ مگر جس طرح ہندوستان کے بت پرستوں میں رامائن اور مہا بھارت کے متعلق مبالغہ آمیز بیانات اور اشعار مشہور ہیں، ویسے ہی عربوں میں بھی تھے، ان میں سے اُن باتوں کی صحت میں شبہ نہیں، جس کی تصدیق قرآن پاک یا احادیث صحیحہ سے ہوتی ہے، لیکن اس کے بعد وہ باتیں بھی قابلِ سماعت ہو سکتی ہیں، جو مختلف بیانات میں قدر مشترک کا حکم رکھتی ہوں۔

ادب جاہلیہ کی دو قسمیں ہیں: شعر اور نثر۔ شعر کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، نثر کے مقابلہ میں عرب میں شعر کا رواج زیادہ تھا، البتہ یہ ذخیرہ تحریری سرمایہ کی صورت میں بہت محدود ہے، اس ذخیرہ میں مدح، ہجو، تہنئہ، مرثیہ، فخر، شجاعت، تشبیب، غزل غرض جملہ انواع ادب موجود ہیں۔

سیرت کا ادب جاہلیہ سے تعلق:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بچپن عربوں کے رواج کے مطابق دیہات میں گزارا، جہاں اصل عربی کا رواج تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو مثال استعارے محاورات استعمال ہوتے ہیں، انہیں ادب جاہلیہ کے ذریعہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بھی اصل عربی کو زندہ رکھنے کے لیے ادب جاہلیہ سے استفادہ کرنے کا حکم دیا تھا۔

دوسرے یہ کہ اس ادب کے ذریعہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پس منظر، عہد نبوی کی مشکلات عربوں کے رسم ورواج کو سمجھ کر قرآن کریم اور سیرت کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

بیسواں اصل: مخضرمی واسلامی ادب

سیرت نگاری کے اصول میں سے بیسواں اصل میں نے مخضرمی واسلامی ادب کو قرار دیا ہے، یہ وہ عہد ہے جب جاہلیت کی زمین سے اسلامی ادب کا احیاء ہوتا ہے اور اس کی آبیاری میں شعرا کے ساتھ اسلام بھی اپنے اثرات ڈالتا ہے۔ نئی نئی اصطلاحات اور پرانے الفاظ واصطلاحات کو نئے نئے معنی دیئے جاتے ہیں، ادب کے اس نئے چہرہ کو اسلامی ادب کہا جاتا ہے۔

سیرت کا مخضرمی واسلامی ادب سے تعلق:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس قوم میں پیدا ہوئے، وہ ادب اور فصاحت وبلاغت میں معروف تھی اور شعروں سے ان کو محبت تھی، جاہلیت کے المعلقات السبعۃ بہت مشہور ہیں۔ وہ لوگ شعروں کو ہجو، فخر اور غزل میں استعمال کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہا گیا، جس کا قرآن نے انکار کیا۔

قرآن مجید نے ان کے قول کو نقل کیا ہے: **ام یقولون شاعر نتربص بہ ریب المنون** کیا وہ کہتے ہیں یہ شاعر ہے، ہم منتظر ہیں اس پر گردش زمانہ کے۔

قرآن مجید نے ان کی ان باتوں کی تردید فرمائی، بل کہ شاعری کی مذمت کی: **والشعراء یتبعھم الغاوون الم تر انھم في کل وادیھیمون** اور شاعروں کی بات پر بے راہ رو لوگ چلتے ہیں، تو نے نہیں دیکھا کہ

وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور یہ کہ وہ کہتے ہیں، جو نہیں کرتے۔

اور پھر صاف تردید فرمادی۔ **انه لقول رسول کریم وما هو بقول شاعر قليلا ما تؤمنون**، یہ ایک پیغام لانے والے سردار کا کہا ہوا ہے۔ اور یہ کہا ہوا شاعر کا کلام نہیں ہے۔

بل کہ یہ ارشاد فرمایا: **وما علمناه الشعر وما ينبغي له ان هو الا ذكر وقرآن مبين** ہم نے نبی کو شعر کہنا نہیں سکھایا اور نہ شاعری نبی کے شایانِ شان ہے یہ قرآن کریم نصیحت ہے، عقلمندوں کے لیے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی معاشرے کے ایک فرد تھے، اچھے کلام کو پسند فرماتے تھے، خواہ وہ شعر ہو، بل کہ آپ کے کلام میں خود بڑا اثر تھا۔

ابن سیرین کہتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین شاعر تھے: حسان بن ثابتؓ، کعب بن مالکؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ، حضرت کعب دشمن کو لڑائی سے ڈراتے تھے، حضرت حسانؓ نسب پر تبصرہ کرتے اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ دشمن کو کفر سے عار دلاتے تھے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسانؓ کے لیے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں منبر رکھوا دیتے اور وہ اس پر کھڑے ہو کر ان کفار کی ہجو کرتے، جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک حسان رسول اللہ کی مدافعت کرتے ہیں، روح القدس ان کے ساتھ ہیں۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے حضرت حسانؓ کو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شعر پڑھتے ہوئے سنا، تو ان سے باز پرس کی، اس پر حضرت حسانؓ نے کہا "میں ان کی موجودگی میں بھی اشعار پڑھا کرتا تھا، جو آپ سے بہتر تھے۔"

الغرض سیرت نگار کو مخضرمی و اسلامی ادب سے بھی استفادہ کرنا ضروری ہے۔

اکیسواں اصل: علم لغت:۔

سیرت کا لغت سے تعلق: سیرت نگار کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مادری زبان عربی اور لغت فصحا کا علم ہونا چاہیے، عہد نبوی کے لسانی اختلافات اور مستعملہ الفاظ کا بھی علم ہونا چاہیے، اور ان علوم سے سیرت نگاری میں مدد لینی چاہیے، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلنے والے جملوں کے پسِ منظر کو صحیح طور سے سمجھ سکے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فصیح اللسان ہیں، اس فصاحت کو بغیر لغت و تحقیق کے سمجھنا مشکل ہے۔

بائیسواں اصل: علم قرآت ولہجات عرب

سیرت نگار کو علم قرأت ولہجات عرب سے بھی واقفیت یا کم از کم ان کتب سے مستفاد ہونا بھی ضروری ہے، کیوں کہ ابتداء اسلام میں مختلف قبائلی لوگوں کو جن کی مشترکہ زبان تو عربی ہی تھی، لیکن لہجے مختلف تھے، اسی طریقے سے بعض قبائل دوسرے قبائل کے بالمقابل کچھ الفاظ کا استعمال بدل کر کیا کرتے تھے، لیکن لہجے کے بدلنے سے معانی میں تبدیلی نہیں ہوتی تھی، اس لیے انہیں اپنے اپنے لہجہ میں تلاوت قرآن کریم کی اجازت تھی، بعد میں قرآن کریم لکھنے کے لیے معیاری گرامر ولہجہ لغتِ قریش مقرر کیا گیا، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اسی سے تھا اور دیگر لہجوں میں تلاوت کی اجازت بھی (شرائط کے ساتھ) دے دی گئی۔

لہذا اس سے بھی استفادہ ضروری ہے۔

تئیسواں اصل: علم آثار قدیمہ

سیرت نگار کو آثار قدیمہ (آرکیالوجی) کا بھی علم ہونا چاہیے، اس لیے کہ عہد حاضر میں قدیم کتبات، آبادیاں اوران کے آثار، سکے استعمال کی اشیاء تاریخ کی تدوین میں اہم رول ادا کر رہی ہیں۔

سیرت طیبہ سے علم آثار کا تعلق

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا وہ حصہ، جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیبر میں آمد اور فتوحِ قلعہ اور ایک موقع پر دورانِ سفر آپ کا ایک وادی سے تیزی سے گزرنا اور صحابہ کو بتانا کہ یہاں وہ قوم تھی، جن پر عذاب نازل ہوا۔ یہ جگہ کون سی تھی؟ یہاں کون سی قوموں کے آثار موجود تھے؟ یہ علم ہمیں علم آثار قدیمہ سے حاصل ہوتا ہے۔

قصص الانبیاء میں انبیاء کے نزول کا محل وقوع، آبادی، قدامت، بود و باش زیر بحث آتے ہیں، اس علم کی رو سے بھی کافی کچھ استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

آرکیالوجی سے قصص الانبیاء کو بہتر انداز میں سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے؟ جب کہ قرآن کریم بھی "فاقصص القصص" کہہ کر قصے بیان کرنے کا حکم دے رہا ہے اور قصہ میں فرد کے ساتھ اس کے متعلقات مکان، رہائش، استعمال کی اشیاء سب شامل ہیں۔ مکۃ المکرمہ، آب زمزم، صفا مروہ کی تاریخ آثار قدیمہ کی تاریخ ہے، یہ تاریخ بھی نبی کی ذات سے جڑی ہوئی ہے۔ اس لیے اس علم سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔

چوبیسواں اصل: اسلامی معلومات عامہ کا علم

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھنے والے کی عام معلومات بہتر ہونی چاہیے اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماخذ کے طور پر ایسی کتابوں سے استفادہ کرنا چاہیے، جن میں تمام اسلامی معلومات کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے اور یہ معلومات مختلف شکلوں میں موجود ہیں: جیسے ابن قتیبہ (۲۱۳ھ) کی المعارف اس میں آدمؑ سے لے کر عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تک کی اہم معلومات جزئیات کی شکل میں جمع کر دی گئی ہے۔اسی طرح المحبر ابی جعفر محمد حبیب ابن امیہ الہاشمی البغدادی (م ۲۴۵ھ) ۱۹۴۲ء میں دارالمعارف عثمانیہ دکن سے شائع ہوئی ہے، اس میں عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین ان کی اولادوں حتی کہ اولاد کی ماؤں تک کا لقب ہے، مواخات کس کی کس کے ساتھ ہوئی، عرب کے موسم کیسے تھے، کون کون مختون پیدا ہوا، اس جیسی عجیب وغریب جزوی معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔

اسی طرح عبدالحی کتانی کی التراتیب الاداریہ ۲ ر جلدوں میں معلومات واستخراجِ سائل کے حوالہ سے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔

کچھ کتابیں اوائل کے عنوانات سے لکھی گئی ہیں کہ کون سا کام کس عہد میں کس نے سب سے پہلے کیا یا کون سی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سب سے پہلے کس نے کی وغیرہ وغیرہ۔

الغرض اسلامی معلوماتِ عامہ کا علم بھی سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ضروری اوران کے نکھار میں معین ہے، کیوں کہ سیرت نگار جن پہلو پر لکھنا چاہتا ہے، اس پہلو پر پہلے سے موجود کتب کا مطالعہ کرے تو جامع تجزیہ پیش کرسکتا ہے، لیکن اس کے لیے عام اسلامی معلومات کا ہونا ضروری ہے۔

پچیسواں اصل: علم التقویم والتوقیت:۔

سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے ہمیں، جن واقعات کا علم ہوتا ہے، ان میں سے بیشتر واقعات کے وقوع پر متعدد روایات ملتی ہیں، حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کب پیدا ہوئے؟ اور کب وفات پائی؟ اس پر دس سے زیادہ آراء ہیں، ایسا کیوں ہوا؟ میں (مصنف کتاب) اس کی معقول وجہ بیان کرنے سے قاصر ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ ایک سبب علم تقویم کے بعد کا نتیجہ ہے۔

لہذا سیرت نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم تقویم سے آگاہ ہو، عیسوی و ہجری تاریخوں میں مطابقت وتحویل کر سکے، مسلمانوں میں ہجری تقویم کی جگہ شمسی تقویم کا رواج ہے، حالاں کہ ہجری تقویم اصل ہے، اور فطرت کے مطابق ہے، اس لیے کہ بقیہ تمام تقویمیں ظن وتخمین کی بنیاد پر ہیں۔ اور اسی پر بس نہیں بل کہ رومی تقویم، گریگورین تقویم، عبرانی تقویم ان میں کفریہ وشرکیہ ناموں کا رواج رہا ہے، جب کہ ہجری تقویم خالص اسلامی تقویم ہے، اور تمام شرکیہ ناموں اور نجوم پرستی وشخصیت پرستی سے مبرا ہے، اس لیے ان تقویمات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

لہٰذا جو کوئی سیرت پر مفصل، محقق اور مفید مواد جمع کرنا چاہتا ہے، تو وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنا سفر شروع کرے، انشاءاللہ امید ہے کہ اپنے مقصد میں کافی حد تک بامراد ہوگا۔

وضاحت: یہ تمام اصول اصول سیرت نگاری تعارف مآخذ ومصادر نامی کتاب جو مکتبہ یادگار شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا ملخص ہے، جسکے مصنف پروفیسر ڈاکٹر صلاح الدین ہیں، جنھوں نے ۴۳۴ر صفحات پر مشتمل یہ کتاب لکھی ہے، یہاں پر نہایت اختصار کے ساتھ ان اصول کو تحریر کیا گیا ہے، ورنہ مصنف نے بڑے حسن ترتیب سے تمام اصول کو بیان کیا ہے۔ اصول کی لغوی واصطلاحی تعریف، موضوع پر تصنیف کا جائزہ، موضوع کی اہمیت اور اس کے مأخذ، خصوصیات، ارتقاء اور نامور مصنفین اور ہر اصل کا سیرت سے تعلق، اور سینکڑوں کتب سے استفادہ اور ان کے حوالے۔ الغرض ان اصول کی تفصیل اور دلائل آپ اس کتاب سے حاصل کر سکتے ہیں۔

اور یہ کتاب آپ کو www.kitabosunnat.com پر مفت مل جائے گی۔

☆......☆......☆

ملخص ہلال الدین بن علیم الدین اشاعتیؔ منیجر شاہراہ علم

شمس العلما شبلی نعمانی اور سرسید احمد خاں کے افکار

نبوتِ محمدی اور سیرت نبوی کے حوالہ سے

حکیم فخر الاسلام مظاہری، علیگ (ایم ڈی)

غالباً یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سرسید احمد خاں اور محقق شبلی نعمانی کے افکار میں مناسبت وموافقت اور خیالات میں یکسانیت کافی زیادہ پائی جاتی ہے، چنانچہ شیخ محمد اکرام نے اپنے تحقیقی رسالہ شبلی نامہ میں نہ صرف اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے بلکہ اس کے وجوہ وعلل پر بھی گفتگو کی ہے، موصوف کی بیان کردہ صراحتوں سے جن امور کا انکشاف ہوتا ہے، ان میں سے بعض کو ہم یہاں ذکر کرتے ہیں، شیخ موصوف فرماتے ہیں:

''شبلی (۱۸۵۷-۱۹۱۴) نے یکم فروری ۱۸۸۳ء سے علی گڑھ کالج میں کام شروع کیا...... جو علوم یعنی تاریخ وسیر، شبلی کا طرۂ امتیاز ہے وہ انہوں نے...... پہلی مرتبہ علی گڑھ میں سیکھے (شبلی نامہ ص ۴۳)...... شبلی علی گڈھ آنے سے پہلے ہی سرسید کے مداحوں میں سے تھے، لیکن علی گڑھ سے صحیح معنوں میں فیضیاب ہونے اور سرسید سے پوری طرح متاثر ہونے کا موقع انہیں یہاں آنے کی بعد ملا۔ (ایضاً ۴۲)...... قیامِ علی گڑھ میں شبلی پر جتنا اثر سرسید کا ہوا کسی اور کا نہ تھا...... پھر ایک زمانہ میں شبلی سرسید کے رنگ میں رنگ گئے۔ یہ رنگ اخیر میں ڈھلنا شروع ہو گیا۔'' (ص ۴۷) موصوف یہ بھی کہتے کہ ''شبلی کے علاوہ اور کون تھا جسے اتنی مدت تک (یعنی ۱۶ سال کے عرصہ تک) اور اپنے قرب ویگانگت سے علی گڑھ کے اس پیر میکدہ سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔'' (ایضاً ص ۴۸)

''علی گڈھ میں سید صاحب (سرسید ۱۸۱۷-۱۸۹۸۔ف) نے انہیں اپنی کوٹھی کے احاطہ کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی...... اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلا ناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی۔'' (ص ۴۸) ''سرسید نے شبلی کی اُس علم میں رہنمائی کی جو آج ان کا تاجِ فضیلت ہے''۔ (ص ۴۹) یعنی سیرت کا مطالعہ، سیرت کے مباحث پر تحقیق اور بحیثیت موضوعِ علم کلام کے سیرت کے ایک خاص دبستانِ خیال اور مکتبِ فکر کے لیے استناد۔

''چوں کہ شبلی اور سرسید کا تالیفِ سفر کے دوران میں دن رات کا ساتھ تھا اور شبلی کے عقائد بھی (جیسا کہ ان کی بعد کی تصانیف مثلاً الکلام اور علم الکلام سے صاف نظر آتا ہے) سرسید سے ملتے جلتے تھے۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ تفسیر کی تالیف کے دوران میں اکثر دونوں میں تفسیری مباحث پر گفتگو ہوتی ہوگی اور اگر سرسید کی تفسیر میں مصنف کے سوا کسی اور کا ہاتھ ہے تو وہ مولانا فاروق کے بھائی کا نہیں بلکہ ان کے

جانِ استاد، شاگرد شبلی کا ہے۔'' (ص ۵۶)

اصل میں اقبال سہیل نے یہ بات کہی تھی کہ ''سرسید نے اپنی تفسیر میں جو رقم طرازیاں کی ہیں وہ خود ان کے دل و دماغ کی پیداوار نہ تھیں بلکہ ان کا بیشتر حصہ مولانا فاروق کے بڑے بھائی مولانا عنایت اللہ رسول چریاکوئی کے خرمنِ کمال سے مستعار لی تھیں۔'' اس پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام نے مذکورہ بالا تنقیح وتنقید کرنا ضروری سمجھی۔

سرسید سے شبلی کے تعلق اور عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''سرسید سے ان کی عقیدت کا سب سے بااثر اظہار مثنوی امید میں ہوا ہے جو ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی......اس کی نسبت جدید اردو شاعر کے مصنف نے بالکل بجا کہا ہے کہ ''اس میں سرسید احمد خاں کا جیسا پاکیزہ کردار شبلی نے اشاروں میں کھینچ دیا ہے وہ حالی کی حیات جاوید سے بھی نہ ہوسکا''۔ (ص ۵۷)

سرسید کے ساتھ فکری ہم آہنگی اور قلبی عقیدت ہوتے ہوئے بھی علی گڑھ سے شبلی علیحدہ ہوگئے ،اس کے سبب کا تجزیہ کرتے ہوئے اور اشتباہ رفع کرنے کی غرض سے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں: ''علی گڑھ کالج سے شبلی کی علیحدگی کا باعث سرسید سے اختلافات نہ تھے کیوں کہ اگر شبلی کے لیے سرسید کے ساتھ مل جل کر کام کرنا مشکل ہوتا تو وہ سرسید کی زندگی میں کالج سے علیحدہ ہوجاتے۔''

اگر چہ یہ نتیجہ ضروری تو نہیں ہے کیوں کہ بعض اختلافات سرسید کے ساتھ حیاتِ سرسید میں بھی ضمنی نوعیت کے موجود تھے، نیز بعض اختلافات ایسے بھی تھے جن کی موجودگی میں مل کر کام کرنا آسان نہ تھا ۔لیکن مولانا سید سلیمان ندوی سے شیخ محمد اکرم کی شکایت بہرحال کچھ بجا سی معلوم ہوتی ہے، لکھتے ہیں: ''سید سلیمان نے شبلی کے خطوط ،مضامین اشعار مرتب کئے ہیں ان چیزوں کو مرتب کرتے وقت انہوں نے بہت سی قابلِ اعتراض باتوں پر (جو سرسید سے مناسبت ،موافقت اور فکری یکسانیت کو ظاہر کرتی تھیں ان باتوں پر۔ف) سیاہی پھیر دی ہے لیکن عقیدت مند آنکھوں کو قابلِ اعتراض باتیں مشکل سے ہی نظر آتی ہیں اور سید سلیمان کی احتسابی کارروائی کے بعد، اب بھی ان چیزوں کا یہ عالم ہے کہ آپ شبلی کی شخصیت کے خلاف کوئی فردِ جرم مرتب کرنا چاہیں تو آپ کو شبلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تائیدی دستاویزات مل جائیں گی۔'' سرسید کی صحبت سے شبلی کے عقل و دماغ میں جو فکر وخیال اور سرسید کا طریقہ انفارمیشن رچ بس گیا تھا، صحبت وتعلق کے ان ایام کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام مزید لکھتے ہیں:

''سرسید نے شبلی کو الفاروق کے بجائے الغزالی لکھنے کا مشورہ دیا۔شبلی نے اس وقت تو یہ مشورہ قبول نہ کیا لیکن جب الفاروق سے فارغ ہوئے تو الغزالی لکھنے کا خیال آیا۔اس وقت ان پر کلامی اور معتزلی رنگ چھایا ہوا تھا۔'' یہاں اس بات کی صراحت نا مناسب نہیں ہے کہ شبلی جدید معتزلی تھے، اور یہ بات مستغنی عن الحجۃ ہے۔ چنانچہ مولانا سید عبدالحی حسنی جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بانیوں میں سے تھے اور تحریک مذکور کے حوالہ سے مدتوں شبلی کے رفیقِ کار رہے، انہوں نے صاف لکھا ہے کہ شبلی ''عقائد کے معاملہ میں معتزلی تھے'' اور ایک انہی کے لکھنے پر موقوف نہیں، بلکہ شبلی کی تحریریں، ان کے فکری اعتزال کی شاہد ہیں۔'' چنانچہ انہوں نے الغزالی کو اپنے کلامی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔مولانا شبلی مہدی حسن کو جنہوں نے الغزالی کی تشنگی کی شکایت کی تھی لکھتے ہیں:''سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ علماء وغیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں اس کے لیے زینے درکار ہیں۔الغزالی پہلا زینہ ہے دوسرا تاریخ علم الکلام پھر اصل سطح یعنی علم کلام جدید ہے جو زیر تصنیف ہے،غزالی میں اگر کھل کھیلتا تو علماء برسوں بلکہ قرنوں کے لیے ہاتھ سے نکل جاتے، اور مجھ کو ان سے کٹ کر الگ ہوجانا منظور نہیں بلکہ ع میں تو ڈوبا ہوں......'' (ص ۱۰۳)

نبوت محمد اور سیرت نبوی کے حوالہ سے جہاں تک سرسید کی بات ہے تو اس باب میں ڈاکٹر ظفر حسن کی یہ بات کچھ غلط نہیں معلوم ہوتی اور جو شخص بھی سرسید کی تصنیفات خصوصاً تفسیر قرآن اور خطبات احمدی پر نیز سرسید کے اختیار کردہ تفسیری، کلامی اصولوں پر نظر رکھتا ہوگا اس کے لیے بھی انکار کی گنجائش مشکل ہوگی کہ ''مابعد الطبیعاتی شعور کا فقدان ان کے ہاں بالکل واضح ہے۔'' البتہ سرسید اور شبلی میں فرق یہ ہے کہ جب بیسویں صدی میں اصولِ فطرت کے حوالہ سے ماوراء حسی ادراکات کو اصولاً ممکن قرار دے دیا گیا اور علومِ جدیدہ میں اب اس کا انکار نہیں رہا، تو علامہ شبلی کے ہاں بھی قدرتی طور پر ایسی چیزوں مثلاً روح وغیرہ کا اعتراف ہے یعنی جن چیزوں کا سرسید کے ہاں صاف انکار ہے علامہ شبلی کے ہاں اس کا اقرار ہے لیکن اس قسم کے اقرار کو شبلی نے مادہ کے دسترس سے، تو خارج قرار دیا لیکن تسلیم اسباب طبعیہ کے تحت ہی کیا تا کہ قانون فطرت کے خلاف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ انہوں نے توجیہات جو کچھ کی ہیں، وہ قانونِ فطرت کے زیر اثر ہی ہیں۔یعنی موصوف نے یہ سمجھا اور سمجھایا ہے کہ نبی کی قوتِ قدسیہ کے اثر سے یا بالفاظ دیگر تصرف سے معجزہ سرزد ہوتا ہے۔

ظفر حسن خاں سرسید کے متعلق یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے لیے ''دلِ دردمند'' کے ہاتھوں

مجبور ہوکر اصلاح معاشرہ کی دھن میں پیروی مغرب میں ایسے جتے کہ اور بہت سے خیالات کی طرح انہوں نے فطرت کے بارے میں بھی مغرب سے بعض چلتے ہوئے نظریات لیے...... اور ان کی بنیاد پر تفسیر قرآن سے لیکر سیاست و سماجیات تک اپنے افکار کی عمارت اٹھا دی۔

(دیباچہ از کبیل احمد "سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت"، از ڈاکٹر ظفر حسن)

مذکورہ ہر دو حضرات کے متعلق ایک بات یہاں خاص طور سے اہم ہے وہ یہ کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ حضرات مخلص ہیں اور ان کی نیت اچھی ہے اور اس میں ہمیں بھی کچھ کلام کرنے کی ضرورت نہیں، نہ سرسید کے متعلق نہ شبلی کے متعلق۔ شبلی جب سیرت النبی کی تصنیف کا محرک یہ ذکر کرتے ہیں کہ: یوروپ کے مورخین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں، وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے۔ آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کردیا ہے، اس لیے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے، تو ان ہی یوروپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے، جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کردی تو اس کا فرض ادا ہوگیا۔ اس بات سے اس کا منصب نبوت میں کوئی فرق نہیں آتا کہ اس کے دامن اخلاق پر دھبے بھی ہیں۔ یہ واقعات تھے جنہوں نے بالآخر مجبور کیا اور میں نے سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کرلیا۔

(سیرت النبی ص ۳۶)

(جاری......)

☆......☆......☆